قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ناشر: شیخ عبدالحمید

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۴ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۳ ——— اکتوبر ۱۹۹۰ء ——— شمارہ ۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فی پرچہ: ۵/- روپے

فہرست مضامین

۱	ضروری التماس	ادارہ	۲
۲	لمعات	ادارہ	۳
۳	محمدؐ کی کہانی خدا کی زبانی	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۱۰
۴	حقیقت خرافات میں کھو گئی	اکبر سعید	۲۸
۵	فہرست مطبوعات طلوعِ اسلام		۳۲
۶	حقائق و عبر	ادارہ	۳۴
۷	نقد و نظر	ادارہ	۳۹
۸	حقوقِ انسانیت کا ضامن.....	ثریّا عندلیب	۴۱
۹	رابطۂ باہمی	ادارہ	۴۹
۱۰	سیاسی پارٹیاں	ادارہ	۵۴
۱۱	قرآنی تعلیم بچوں کیلئے (مومن)	قاسم نوری	۵۹
۱۲	قوم، قومیت اور دو قومی نظریہ	عبداللہ ثانی	۶۳
۱۳	POLITICAL PARTIES IN ISLAM. A.R ADAL		۷۱
۱۴	QURANOCRACY G.R AZHAR		۷۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضروری التماس

۱ اگر آپ کا خریداری نمبر انگریزی حرف "D" سے شروع ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا زرِ شرکت ختم ہو چکا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ مبلغ ۸۰/- روپے کا منی آرڈر یا چیک بھیج کر دسمبر ۱۹۹۱ء تک تجدید کرالیں۔ نومبر کا پرچہ زرِ شرکت موصول ہونے پر ہی بھیجا جائے گا۔

۲ نوّے فیصد سے زائد قارئین کا زرِ شرکت دسمبر ۱۹۹۰ء میں ختم ہو رہا ہے ان سے بھی التماس ہے کہ وہ سال ختم ہونے سے پہلے اگلے سال کے لئے تجدید کروالیں تاکہ ترسیل منقطع نہ ہونے پائے۔

۳ رسالہ بذریعہ V-P بھجوانے پر 13/- روپے زائد خرچ آتا ہے۔ اس لئے زرِ شرکت بذریعہ منی آرڈر یا چیک بھجوانا قارئین کے لئے سُود مند ہوگا۔ رسالہ بذریعہ VP قارئین کے طلب کرنے پر ہی ارسال کیا جائے گا۔

تعزیت

طلوعِ اسلام کے حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و الم سے سنی جائیگی کہ لندن بزم کے نمائندہ جناب مقبول محمود فرحت کے والدِ گرامی چند روز کی علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے کُوچ فرما گئے۔

مرحوم قرآنی فکر کے شیدائی اور شعر و ادب کے دلدادہ تھے ——— تحریکِ طلوعِ اسلام کا ہر فرد جناب فرحت کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عنایت فرمائے۔ ——— ناظم ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مُجرم کون ؟

۶ اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق خان نے آئین کے تحت حاصل شدہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی توڑ دی، جس کے ساتھ ہی وفاقی حکومت بھی ختم کر دی گئی۔ صدر نے قومی اسمبلی توڑنے کے بعد قوم سے خطاب کرتے ہوئے سابق حکومت پر اقربا پروری، بدعنوانی قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ جیسے الزامات عائد کئے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے (سابقہ) برسرِاقتدار یا ذمہ دار افراد میں سے بعض کے خلاف عدالتوں میں مقدمات دائر ہیں۔ اکثر کے خلاف تحقیق و تفتیش کا عمل جاری ہے۔ اگر وہ واقعی مجرم ہیں تو وہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ مجرم ہیں بھی تو انہیں صاحبِ اقتدار بنایا کس نے تھا؟ اگر ہم انہیں ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں کامیاب نہ کراتے تو وہ اس قسم کی بدعنوانیاں کس طرح کر سکتے! ان کے پاس کوئی ذاتی قوت نہیں تھی۔ یہ ساری قوت خود ہماری تفویض کردہ تھی۔ بقول کسے : ؎

تمہیں تو "تم" کے سوا، کوئی کچھ نہ کہتا تھا!
جناب ہم نے بنایا، حضور ہم نے کیا!

آپ کہیں گے کہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ اس قسم کے ہیں؟ اور یہی تو آپ کا بنیادی قصور ہے۔ یہی وہ سب سے بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں آپ بھی اس عذاب میں مبتلا ہیں ـــــ اور ہمارا، آپ کا، یہ جرم، یہ قصور، کچھ نیا نہیں۔ ہم شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج قوم کی طرف سے مطالبات ہو رہے ہیں کہ اس کی انکوائری کرو، اس کی تحقیق کرو لیکن اگر آپ یہی مطالبہ اس وقت کرتے جب یہ لوگ انتخابات کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے، تو نہ تباہی آتی اور نہ ہی آپ اس عذاب

میں مُبتلا ہوتے اور یہ کچھ ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، یہاں شروع ہی سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ جو لوگ برسرِاقتدار آنا چاہتے ہیں، ہم ان کی انکوائری نہیں کرتے۔ لیکن جب وہ اقتدار سے برطرف ہو جاتے ہیں تو ان کی انکوائریاں کراتے پھرتے ہیں۔ اِن انکوائریوں سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ لوگ مُجرم ثابت ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ سزا مِل جاتی ہے۔ لیکن کیا اس سے ان بے پناہ نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے جو وہ مُلک اور مملکت کو پہنچا چُکے ہوتے ہیں؟ اور تماشا یہ کہ ہم ان کی تو انکوائریاں کراتے ہیں لیکن جو ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہوں، ان کی انکوائریوں کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بلا دیکھے بھالے، آنکھ بند کرکے، ان کے حق میں ووٹ دے کر انہیں برسرِاقتدار لے آتے ہیں۔ اور جب وہ تباہی مچا چُکتے ہیں اور اقتدار ان سے چھن جاتا ہے تو ان کی انکوائریوں کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی انکوائریوں کے مطالبہ کے پیچھے جذبہ یہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے قوم اپنے آپ کو یہ (جھوٹا) اطمینان دِلا لیتی ہے کہ اِن تباہیوں کے ذمّہ دار ہم نہیں، یہ لیڈر ہیں۔ قوم اِس خود فریبی میں مُبتلا ہو جاتی ہے، اور اِس کے بعد اقتدار پھر ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جس کے متعلق کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کی ہوتی، جب وہ بھی وہی کچھ کرتے ہیں تو پھر یہ چیخنے چلاّنے لگ جاتی ہے۔ اِس ضمن میں قرآنِ کریم ایک ایسا اصول لبطور راہنمائی دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے قوم اِس قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے نبوّت کا دعوےٰ کیا۔ یہ بڑا عظیم دعویٰ تھا۔ قوم نے آپؐ سے کہا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اس دعوے میں سچّے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اِس سوال کے جواب میں حضورؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں کونسی شہادت پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ:-

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

مَیں تم میں اجنبی نہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اِس دعوے سے پہلے (مِنْ قَبْلِہٖ) تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ تم میری سابقہ زندگی پر غور کرو اور پھر جذبات سے الگ ہٹ کر، عقل و فکر کی رُو سے فیصلہ کرو کہ کیا اس قسم کی زندگی جھوٹوں کی ہوتی ہے یا سچّوں کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں اصول کیا پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہ ہر مدعی کے ماضی (سابقہ زندگی) کو سامنے لاؤ اور اس سے پرکھو کہ اس کا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھے نبی تسلیم کرلو

ں گے بعد دیکھو کہ میں کس قسم کا انسان ثابت ہوتا ہوں۔ فرمایا یہ کہ تم میری سابقہ زندگی پر غور کر
ں سے اندازہ لگاؤ کہ میں کس قسم کا انسان ہوں۔ میرا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ اگر ہم اس اصول کو
پنے سامنے رکھ لیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں کہ جو شخص کسی منصب یا اقتدار کے لئے آگے
ہے، اس کی سابقہ زندگی اس کے متعلق کیا کہتی ہے، تو ہم ان تباہیوں سے بچ جائیں گے۔
اس میں شبہ نہیں کہ اس کے باوجود بعض افراد ایسے نکل آئیں گے جو اختیارات ہاتھ میں
آنے کے بعد بدعنوانیاں کرنے لگ جائیں لیکن یہ مستثنیات..... (EXCEPTIONS) ہونگی۔
جب ان لوگوں کے ساتھ کام کریں گے جن کی اکثریت دیانتداروں پر مشتمل ہوگی تو انہیں بدعنوانیوں پر
اترنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ فرد کے لئے اس کے رفقاء کا کردار بڑا مؤثر ہوتا ہے اور لغزشوں کی
روک تھام کا موجب۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ: كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (۹:۱۱۹)
سچوں کی رفاقت اختیار کرو۔

کسی شخص کے ماضی کے کردار کو پرکھنے کے لئے ہمارے صدرِ اوّل کے معاشرہ نے ہمارے لئے بڑی برجستہ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے، ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنے دعوے کی تائید میں کسی قابلِ اعتماد آدمی کو پیش کرے۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے پوچھا کہ:

- کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے؟ اس نے کہا، نہیں!
- پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟ اس نے کہا، نہیں!
- آپ نے پھر پوچھا۔ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا۔؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپؓ نے فرمایا کہ:-

"پھر تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے"

(شاہکارِ رسالت ص ۲۴۴)

اس قسم کی تحقیق، فردِ متعلقہ کی ذات تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اس کے اہلِ خانہ کو بھی محیط ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ:-

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے

اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دوگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے جو چاہے ان کے اندر رہے۔ (شاہکارِ رسالت۔ ص۲۹۷)

اہلِ خانہ ہی کو نہیں۔ اس میں اس کے دوستوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حقوق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے معاف فرمایئے۔ مجھے اپنا دوست نہ بنایئے! دُور دُور ہی رہنے دیجئے!! (شاہکارِ رسالت ص۲۴۹)

حضرت عمرؓ کا یہ اصول بھی یاد رکھیئے کہ :-

"جو شخص شر پیدا کر کے غالب آیا۔ وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔" (ایضاً ص۴۳۵)

جس شخص کو کسی منصب کے لئے منتخب کرنا مقصود ہو اس کے متعلق دیکھو کہ وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے :-

"جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو وہ اپنی قوم کا سردار نظر آئے اور جب اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔" (ایضاً ص۲۸۵)

انتخاب کے امیدواروں کے ماضی کو اس قسم کے معیاروں کے آئینے میں پرکھو اور جب وہ شرافت، عصمت، دیانت، امانت، حُسنِ معاملہ، انصاف، عدل، وسعتِ قلب، کشادگیٔ ظرف، استغناء وغیرہ کے اصولوں پر پورے اُتریں تو پھر اس قابل سمجھو کہ انہیں اختیار و اقتدار سونپا جا سکتا ہے۔ اس قبل از وقت، انکوائری کے بعد آپ کو نہ تو بعد میں چیخنا چلّانا پڑے گا اور نہ ہی انکوائری کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں ایک صاحبِ اقتدار کھُلے بندوں بدعنوانیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے گھناؤنے جرائم زبان زدِ خلائق ہوتے ہیں۔ اس کے ذاتی کردار کے چرچے عام ہوتے ہیں۔ مخالف پارٹی اس کے خلاف تحقیقات کے مطالبے کرتی ہے لیکن ایک صبح وہ اپنی پارٹی کو چھوڑ کر اسی مخالف پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے۔ اسے پارٹی کے بلند ترین منصب پر سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے سب عیب، ہُنر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسے قوم کا ہیرو بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے افراد ہی نہیں

بھی سیاسی پارٹیاں بھی سیاست میں حصہ لینے کی نا اہل قرار دی جانی چاہئیں جن پارٹیوں کا معیارِ اخلاق یہ ہو کہ اپنی پارٹی میں شامل ہر غنڈا اور بدمعاش انتہائی شریف اور نیکو کار اور مخالف پارٹی کا ہر فرد غنڈہ اور بدمعاش اور پھر پارٹی بدل لینے کے ساتھ ہی بد، نیک اور نیک، بد بن جائے ایسی پارٹیاں کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں!

ہمارے ہاں بددیانتی (CORRUPTION) سے بالعموم مراد روپے پیسے کی بددیانتی ہوتی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن کیریکٹر صرف روپے پیسے کے معاملہ میں دیانتداری کا نام ہی نہیں کیریکٹر تو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے ——— افراد کے خیالات، جذبات، عزائم، ارادے، نفسیاتی رجحانات وغیرہ سب اس میں آجاتے ہیں۔ ایک شخص روپے پیسے کے معاملہ میں تو دیانت دار ہے لیکن لیکن جھوٹا، منافق، خوشامدی، جاہ پرست، تنگ نظر، حاسد، کمینہ فطرت ہے۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں اقتدار سونپ دینا، کچھ کم تباہی کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معنی میں دیکھئے تو ایسا شخص، روپے پیسے کے معاملہ میں بددیانت آدمی سے بھی زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مالی نقصان کا ازالہ تو ممکن ہے لیکن اِس قسم کا صاحبِ اقتدار قوم کو جس قسم کا نقصان پہنچا جاتا ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔ وہ تو معاشرہ کے سارے تالاب کو گندہ کر جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید میں جرائم کا ذکر تو ایک آدھ بار آتا ہے لیکن منافقین کی تباہ کاریوں کے تذکرہ، اور ان سے محتاط رہنے کی تاکیدات سے قرآن بھرا پڑا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص پارٹی کے اندرونی حلقہ میں ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ برسوں اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بلند ترین مناصب و مدارج پر فائز ہوتا ہے۔ پارٹی کے ہر اہم فیصلہ اور اقدام میں کبھی شریک اور کبھی مشیر ہوتا ہے۔ اس تمام دَوران میں پارٹی کو بالعموم اور پارٹی لیڈر کو بالخصوص مُلک کے لئے آیۂ رحمت اور قوم کے لئے سایۂ عاطفت قرار دیتا ہے۔ اپنے قائد کے جمال کو نوشیروانی عدل کا عکاس اور اس کے جلال کو اسد اللٰہی شمشیر کا آئینہ دار بتاتا ہے۔ وہ برسوں اِس قسم کی قصیدہ خوانی میں مصروفِ نشید رہتا ہے۔ تا آنکہ وہ ایک دن اپنے منصب سے الگ کر دیا جاتا ہے تو جھٹ سے مخالف پارٹی سے جا ملتا ہے اور ببانگِ دہل آواز دیتا ہے کہ آؤ لوگو! میں تمہیں بتاؤں کہ یہ پارٹی کس طرح ڈاکوؤں اور لٹیروں کی جماعت ہے۔ اور اس کا لیڈر کتنا بڑا فرعون، نمرود، شداد اور یزید ہے۔ اور اس کے بعد وہ گلی گلی، کوچہ کوچہ، ان دہشت انگیز جرائم کی

نقاب کشی کرتا ہے جن کا (بقول اس کے) اس پارٹی کی طرف سے، اس عرصہ میں ارتکاب ہوا تھا جس عرصہ میں وہ خود اس پارٹی میں شریک تھا۔ قوم، اس کی بیان کردہ وحشت و بربریت کی داستانوں کو مزے لے لے کر سنتی ہے اور اس سے کوئی اتنا نہیں پوچھتا کہ یہ سب داستانیں اس دور سے متعلق ہیں جب آپ خود اس پارٹی کے اندرونی حلقہ میں شامل تھے۔ اس لئے اگر آپ اِن جرائم کے ارتکاب میں خود شریک نہیں تھے تو کم از کم ان کے رازدان تو تھے، لہٰذا آپ ؎

بچتے نہیں مؤاخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو!

اگر آپ اِن رازہائے درونِ پردہ کا انکشاف اس وقت کرتے جب یہ پہلی مرتبہ آپ کے علم میں آئے تھے تو قوم ان سے بروقت متنبہ ہو جاتی اور ان کے تدارک کی کوئی تدبیر سوچ لیتی۔ آپ برسوں اِن خفیہ جرائم کو ہوتا دیکھتے رہے، اور نہ صرف یہ کہ قوم کو ان سے خبردار نہ کیا، بلکہ ان کے مرتکبین کے حق میں مدح و ستائش کے قصائد پڑھتے رہے اور اس طرح قوم کو فریب دیتے رہے۔ آج آپ اپنے آپ کو بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

اتنا ہی نہیں کہ قوم میں سے کوئی ایسے لوگوں سے یہ سوال نہیں پوچھتا، بلکہ جس پارٹی میں یہ شامل ہو جاتے ہیں وہ انہیں قوم کا ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے! آپ سوچیئے کہ اگر کل کو اِس قسم کی پارٹی اور اس میں شامل اس قسم کے کیریکٹر کے افراد برسرِاقتدار آ جائیں، تو یہ کیا کچھ نہیں کریں گے؟ جُرم کے مرتکب ہی مُجرم نہیں ہوتے، جرائم کی پردہ پوشی کرنے والے، اور ایسے لوگوں کو ہیرو قرار دینے والے سب زمرۂ مجرمین میں شامل کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ نے افرادِ قوم کے ماضی کی چھان بین کرنی ہے تو اسے روپے پیسے تک محدود نہ رکھیئے۔ ان کے اس قسم کے اعمال کی بھی چھان بین کیجیئے کہ ان کے صحیح کیریکٹر کی پرکھ اسی سے ہو سکے گی۔

یاد رکھیئے! عوام کا یہ عذر کہ ہماری گمراہی کے ذمہ دار یہ لیڈر ہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ اِن لیڈروں کو اِس قابل تم نے ہی تو بنایا تھا کہ وہ اس قسم کی بےعنوانیوں کے مرتکب ہوئے۔ اگر تم اقتدار ان کے سپرد نہ کرتے تو ان زیادتیوں کے مرتکب کس طرح ہو سکتے تھے لہٰذا سیاسی لیڈروں کو مطعون کرنے سے پہلے گردن جھکائیے اور دیکھیئے کہ مُلک کو تباہی کی طرف دھکیلنے والے بدکردار سیاسی عناصر کے انتخاب میں خود آپ کا کتنا حصّہ ہے اور اس طرح اصل مُجرم کون ہے؟

اس کے بعد ہم دو لفظ اس گروہ سے بھی کہنا چاہتے ہیں جو سابقہ پارٹی کی جگہ برسرِ اقتدار آنے کے لئے کوشاں ہے اور وہ دو لفظ یہ ہیں کہ اس وقت آپ میں اور سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہیں اقتدار کے استعمال کرنے کا موقع مل گیا تھا اور آپ کو ابھی وہ موقع نہیں ملا۔ اس فرق سے آپ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے دیں کہ سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی عیوب کا مجسمہ تھی اور آپ کا گروہ پاکبازوں پر مشتمل ہے۔ اگر آپ برسرِ اقتدار آنے کے بعد، عبرتناک انجام سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے گروہ میں شامل افراد کا ابھی سے محاسبہ کیجئے اور صرف ان لوگوں کو اپنے ساتھ رکھئے جن کا ماضی آئینہ کی طرح شفاف ہو۔

یاد رکھئے! قانونِ خداوندی کی رُو سے، اقتدار عیش سامانیوں کا ذریعہ نہیں ہوتا، وہ قوموں اور جماعتوں کے کیریکٹر کے پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے آنے والوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴)

"(ان جانے والوں کے بعد) ہم نے تمہیں اقتدار دیا تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو"

نہ ہی آپ عوام کے نعروں سے فریب میں آجائیں۔ ہماری قوم کا شیوہ یہ ہے کہ یہ ہر آنے والے کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی ہے اور جب وہ جاتا ہے تو اسے جوتیوں سے نوازتی ہے.... اسے جوتیوں سے نوازتی ہے اور آنے والے پر پھول نچھاور کرتی ہے اور اس کے جانے پر، اس سے بھی وہی سلوک کرتی ہے جو سابقہ جانے والے کے ساتھ کیا تھا۔ آپ اپنے ملک کی چالیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور اس آمد و رفت کے مناظر کو سامنے لائیے۔ وہ انہی پھولوں اور جوتیوں کا مرقع نظر آئیں گے۔ سعدی نے اسی لئے کہا تھا کہ: ؎

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری — شادی مکن کہ باتو ہمیں ماجرا رود

اگر ہمارے ہاں کے آنے، جانے اور جانے، آنے والے اس نکتہ کو سمجھ لیں، اور قوم اس حقیقت سے واقف ہو جائے کہ پھولوں کے ہار اسی گردن میں ڈالنے چاہئیں جو اس کی مستحق ہو، تو آج قوم کا نصیبہ جاگ اُٹھے ——— لیکن ایسا شعور تو قرآنی اقدار کی تعلیم اور اس کے مطابق تربیت سے بیدار ہوتا ہے اور اسے کوئی درخور توجہ نہیں سمجھتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں مسلسل یہ کوشش چلی آرہی ہے کہ سادہ دل مسلمان ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے ——— یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اور اس کا کسی کو احساس ہی نہیں اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۳) تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے

محمدؐ کی کہانی ۔ خدا کی زبانی

(پرویز)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاکؐ مرتبہ دانِ محمدؐ است

عید میلاد النبیؐ کی تقریب پر پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا موضوع تھا۔

"محمدؐ کی کہانی ــــــ خدا کی زبانی"

اس درس کو انھوں نے قارئینِ طلوع اسلام کے افادہ کی غرض سے مقالہ کی شکل میں منضبط کر دیا

جسے بمسرت درج ذیل کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام

خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود ہی لیا۔ اسے خدا کی ربوبیت کہتے ہیں۔ حیوانات تک پرورش محض طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے صفحۂ ارض پر سامانِ رزق کو پھیلا دیا۔ اور ساتھ ہی ہر نوع (SPECIES) کو وہ ہدایات (DIRECTIONS) دیدیں جن کے مطابق وہ سامانِ رزق سے مستفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہدایات ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی ہے۔ انھیں جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ یہی وہ جبلت ہے جس کی رو سے (مثلاً) بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے اور مرغی کا چوزہ خشکی کی طرف دوڑتا ہے۔ یا بکری گھاس کھاتی ہے گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی اور شیر گوشت کھاتا ہے گھاس کی طرف تکتا نہیں خواہ وہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔

انسانی ہدایت کا پس منظر

انسان کو دُہری زندگی ملی ہے۔ ایک تو وہی طبعی زندگی (اس کے جسم کی زندگی) جو ہر حیوان کو ملی ہے۔ اور دوسری "انسانی زندگی" جو کسی حیوان کو نہیں ملی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچے کو بھی اس امر کی ہدایت پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے کہ وہ بھوک کے وقت کس طرح اپنے رزق (دودھ) کے چشموں سے فائدہ اٹھائے۔ اس چیز کے لئے اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک اس کی "انسانی زندگی" کا تعلق ہے، اس کے لئے انسان کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہوتی۔ یہ ہدایت اسے خارج سے ملتی ہے۔ اس ہدایت کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص انسان کو یہ ہدایت بذریعہ وحی عطا کرتا تھا (اسے خدا کا نبی یا رسول کہتے ہیں) اور وہ اس ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کے لئے اس طریق ہدایت کو اختیار کرنے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ جو ہدایت کسی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دی جاتی ہے، وہ اس ہدایت کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بکری گھاس کھانے پر اور مچھلی پانی میں تیرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ ہدایت اس کے اندر رکھ دی جاتی تو یہ بھی (حیوانات کی طرح) اس پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ باقی نہ رہتا۔ یعنی یہ بھی حیوانات کی سطح پر آجاتا۔ اس لئے اس کی صورت میں، خدا نے یہ کیا کہ اس کی طرف ہدایت (بذریعہ انبیاء کرامؑ) خارج سے بھیجی اور اس سے کہہ دیا کہ یہ چاہے تو اسے اختیار کرلے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ اگر یہ اسے اختیار کرے گا تو اس کے شرفِ انسانیت کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اگر یہ اس سے انکار کر دے گا تو حیوانی سطح پر رہ جائے گا اور اس کی زندگی جہنمی ہو جائے گی۔

آخری ہدایت

جن حضرات (انبیاء کرامؑ) کی وساطت سے خدا کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچتی تھی وہ پہلے خود اس ہدایت پر عمل کرتے تھے اور ان کا یہ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا تھا۔ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور نبی آخر الزماں، محمد رسول اللہؐ پر جا کر ختم ہو گیا[1]۔ یعنی خدا نے جو ہدایت نوعِ انسانی کو دینی تھی وہ قرآن کریم میں تکمیل تک پہنچ گئی جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا۔ اس لئے اس کے بعد کسی مزید آسمانی ہدایت کی ضرورت نہ رہی اور جب کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو کسی ہدایت لانے والے (نبی یا رسول) کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں یہ بتایا ہے کہ جو ہدایت اس میں دی گئی ہے اصولی طور پر وہی ہدایت پہلے انبیائے کرامؑ کو بھی دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سابقہ انبیائے کرامؑ کے زندگی کے احوال و کوائف بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے اس ہدایت کو کس طرح

---

[1] قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ تمام اقوامِ عالم میں جاری رہا تھا اور کوئی بستی ایسی نہیں گذری جس میں خدا کا رسول نہ آیا ہو لیکن اس نے تفصیلی طور پر صرف سامی اقوام کے انبیائے کرام ہی کا ذکر کیا ہے کیونکہ قرآن کریم کی اوّلیں مخاطب قوم ان انبیاء کرامؑ سے واقف تھی اور نہ خود بھی سامی اقوام سے تھی۔

پیش کیا۔ اس پر کس طرح عمل کر کے دکھایا۔ اور ان کی قوم کی طرف سے ان کی دعوت کا کیا جواب ملا جس طرح اُس نے انبیائے سابقہ کے متعلق یہ کچھ بتایا ہے اسی طرح اُس نے خود نبی آخر الزماں (ؐ) کے متعلق بھی یہ کچھ بیان کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کچھ اس شرح و بسط سے بیان ہوا ہے کہ ان درخشندہ موتیوں کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے سیرتِ نبی اکرمؐ کی سلکِ گہر دار نہایت آب و تاب سے مرتب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

قرآنی سیرت

میں نے اپنی کتاب (معراج انسانیت) میں جو بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے حضورؐ کی سیرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی تفصیل کو سمائی ہوئی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنی اس کوشش ناتمام کو عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر تحفۃً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں[1]۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں پیش کیا جائے کیونکہ احباب کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی خط و خال سلیس زبان میں سامنے لانے چاہئیں تاکہ اس سے ہمارا کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔

نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے محنت کر کے حاصل کر لے۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی جسے یہ خصوصیت عطا کی جانی مقصود ہوتی تھی اس کی شروع سے تربیت خود اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ اس شخص کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی غلط باتوں سے متنفر ہو جاتا تھا۔

تلاشِ حقیقت میں سرگرداں

اُسے حقیقت کا علم تو نہیں ہوتا تھا لیکن باطل کی باتوں میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس سے قرآن کریم نے سب سے پہلے نبی اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷)

ہم نے تجھے (تلاشِ حقیقت میں) سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ سرزمین حجاز کا سب سے بڑا اور مشہور شہر مکہ، اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ، وہاں کے باشندوں اور باہر والوں کے لئے مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ اس توجہ کی بنیادی وجہ خانہ کعبہ ہے جس کا حقیقی مقصد تو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے لیکن اس کی عقیدت لوگوں کو دور دور سے اس کی طرف کھینچ لئے آتی ہے۔ یہ لوگ فرطِ عقیدت میں اس کے گرد جمع ہیں۔ کوئی تالیاں پیٹتا ہے۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی جذب و کیف کے عالم میں اس کے گرد گھومتا ہے کوئی ناچتا ہے کوئی کودتا ہے۔ کوئی بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا مصروفِ

---

[1] یہ مقالہ اس درس پر مبنی ہے جو امسال بتقریب عید میلاد النبیؐ دیا گیا تھا۔

بادہ پرستی ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو ان سے اپنے فسانۂ عشق و محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیان اپنی سحر آفرینیوں سے سننے والوں کی ناک میں نکیل ڈالے جس وادی میں چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہ کسی کے دل میں افسونِ محبت پھونکتے ہیں اور کہیں آتشِ انتقام کے شعلے بلند کرتے ہیں۔

لیکن مکہ کی انہی گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا نظر نہیں آتا۔ اسے حریمِ کعبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں میں کوئی جاذبیت دکھائی دیتی ہے نہ عکاظ کی رستاخیزیوں میں کوئی کشش۔ وہ ان پڑھ ہے لیکن عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں کے پاس جاتا ہے کہ شاید انہی سے حقیقت کا سراغ مل جائے۔ وہ وہاں سے دل برداشتہ اٹھتا ہے تو صحرا کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے اور کائنات کی نیرنگیوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کی ہر مجلس میں جاتا اور کائنات کے ہر گوشے میں گھومتا ہے کہ کہیں سے اسے وہ شے مل جائے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ لیکن ہر مقام سے یہ کہتا ہوا ناکام لوٹتا ہے کہ

عروسِ حقیقت کی بے نقابی

"تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی"

وہ اسی طرح مضطرب و بے قرار پھرتا ہے کہ ایک شب لیلائے حقیقت یک بیک اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے اور اپنے حسین چہرے سے یوں نقاب اٹھاتی ہے کہ اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا (۲/۱۸۵)[1] اور ایسی مبارک رات جس میں خدا کی حکمتِ بالغہ سے حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے۔ اور نوعِ انسانی کو زندگی کی نئی اقدار مل گئیں۔ (۴۴/۴) (۹۷/۱)[2]

یوں خدا کی وحی اس پر نازل ہوئی جو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے!

عطائے وحی

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۴۲/۵۲)

نہ وہ جانتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کوئی توقع تھی۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ (۲۸/۸۶) وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ..... (۴/۱۱۳)

یوں اس متلاشیِ حقیقت کو نبوت عطا ہو گئی اور اسے وہ وہ کچھ سکھا دیا گیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

۱؎ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (۲/۱۸۵)

۲؎ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ. فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴۴/۳-۴) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱)

بہ حالِ نبوت یتیم بھی تھا اور غریب بھی۔ (اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی.... وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی..... ۹۳/۶-۸)۔ نیز نبوت سے پہلے اَن پڑھ بھی۔ (وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ..... ۲۹/۴۸)۔

یوں اس بے یار و مددگار یتیم۔ غریب اور نادار۔ اَن پڑھ۔ صحرا نشین کو تمام عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا معلم بننے کے لئے منتخب کیا گیا۔

---

(۱۴)

عام طور پر خیال یہ کیا جائے گا کہ جب اس شخص نے وہ کچھ پا لیا جس کی اسے تلاش تھی تو پھر وہ زندگی کے باقی دن آرام اور سکون سے بیٹھ رہا ہو گا۔ اس لئے کہ جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر جد و جہد ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یونہی ہوتا ہے لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے نبوت تو بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے لیکن اس کی ذمہ داریاں اس قدر عظیم ہوتی ہیں جن سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے (وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ ۹۴/۲-۳)۔

نبوت کی ذمہ داریاں

چنانچہ منصبِ نبوت پر سرفراز کئے جانے کے بعد، نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یَآ اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ اے وہ کہ جس کے ذمے نظامِ عالم کو درست کرنا ہے۔ قُمْ۔ اٹھ۔ فَاَنْذِرْ۔ اور لوگوں کو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۳) اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ظاہر ہے کہ جس دعوت سے مراد یہ ہو کہ انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط الٹ کر اس کی جگہ ایک جدید نظام قائم کیا جائے، اس دعوت کی مخالفت ہر طرف سے ہو گی۔

دنیا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص غیروں کی مخالفت مول لیتا ہے وہ اپنوں کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کا اپنا قبیلہ اور خاندان ہوتا ہے جو دوسروں کی مخالفت میں اس کا پشت و پناہ بنتا ہے۔ وہ انہی کی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر دوسروں کے خلاف اٹھتا ہے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے داعی کا انداز اس باب میں بھی دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز ہی اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (۲۶/۲۱۴)

سلسلۂ دعوت

اے رسول! اپنے قریبی رشتہ داروں کو، ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو، اس کے بعد آگے بڑھو اور سارے اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ۔ (وَكَذٰلِكَ

اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ..... (۴۲/۷) اس کے بعد اس سلسلہ کو اور وسیع کر دو اور پوری کی پوری عرب قوم کو اس کے دامن تلے لے آؤ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ..... (۱۳/۳۰)

اور اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں ہو گذری ہیں۔ (بھیجا اس لئے ہے) تاکہ جو بات تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے ان کے سامنے پیش کر دے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدائے رحمٰن کا انکار کرتے ہیں (تو انہیں اس پر ایمان کی دعوت دے)۔

اور اس کے بعد اس سلسلے کو ایسا محدود فراموش کر دے کہ یہ تمام نوع انسانی کو اپنے آغوش میں لے آئے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ..... (۷/۱۵۸)

تو عالم انسانیت کو پکار کر کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو نبوت عطا ہونے پر اس ذاتِ گرامی پر عائد کی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ دعوت کیا تھی جسے اس طرح عام کرنے کے لئے اس قدر تاکید کی جا رہی تھی؟

یہ دعوت کیا تھی؟ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی۔ یہ وہی دعوت تھی جو ہر آسمانی انقلاب لانے والے (نبی) کے ذریعے انسانوں تک پہنچائی گئی تھی۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ حکومت صرف خدا (کے قوانین) کی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یعنی

لا الٰہ ۔ الا اللہ

دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن ان میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)۔ خدا کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ دنیا میں اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کا ہو اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تھی محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے کی۔ یہ دعوت تھی مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے کی۔ یہ دعوت تھی ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں ناتواں انسانیت جکڑے چلی آ رہی تھی۔ اور اس کے سر سے اس بوجھ کو اتارنے کی جس کے نیچے وہ بری طرح کچلی جا رہی تھی۔ (وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ ۷/۱۵۷)۔

اعلانِ جنگ اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ دعوت دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار و ذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس لئے اُن کا اس دعوت کے خلاف محاذ بنا کر اٹھ کھڑے ہونا بالکل فطری تھا۔ اس میں ایک طرف ارباب حکومت تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے علمبردار۔ دائیں کو سرمایہ داروں کا گروہ تھا تو بائیں کو فریب کاروں کا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ..... (۲۵/۳۱) اور اس طرح انسانیت کی عدالت کے مجرمین آسمانی دعوت لانے والے نبی کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سرکشی اور مخالفت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بھاری ہے اس لئے ہم پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۴/۳۵) قرآن انہیں مترفین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ آسمانی انقلاب کی دعوت جب اور جہاں بھی بلند ہوئی، اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت

مخالفت ہوئی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴)۔ "ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ وہاں کے تن آسان، خوشحال طبقہ کی طرف اس کے پیغام کی مخالفت نہ ہوئی ہو"۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کی طرف سے نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت ہوئی۔ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا۔ (۷۴/۱۲-۱۳)۔ "ہم نے اسے فراواں دولت اور کثیر بیٹے دیئے تھے جو وہاں موجود تھے"۔ وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (۷۴/۱۴) "اور میں نے اس کے تمام معاملات درست کر رکھے تھے۔ بڑا ساز و سامان دے رکھا تھا۔ یہی تھا جس نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ (۷۴/۲۴-۲۵) یعنی رسول اللہؐ کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے، غلط ہے۔ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ ہے جو یونہی چلا آرہا ہے۔ یہ صرف انسانی کلام ہے"۔ چنانچہ کبھی آپؐ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذاب۔ کبھی شاعر کبھی مجنون۔ وہ اس دعوت کی مخالفت دلیل و برہان کی رُو سے نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی ان کی دلیل اور یہی برہان۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۳) اے رسول! جس طرح آج مکہ کے سردار تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں۔ اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے جس آبادی کی طرف اپنا رسول بھیجا تو وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم اس نئی دعوت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتے چلے جائینگے لیکن انہیں اس دلیل کی کمزوری کا احساس تھا اور اس امر کا یقین کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی قرآن کو توجہ سے سن لیا تو وہ ضرور

قرآن مت سنو اس پر ایمان لے آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اسکی تعلیم دی جارہی ہو وہاں شور مچا دو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اس نئی تحریک پر غالب آسکو۔

قرآن کے متعلق تو وہ یہ کہتے اور خود رسول اللہؐ کے متعلق لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ ذرا دیکھو تو سہی۔ یہ کس قسم کا رسول ہے

کہ یَأْکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ۔ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ رسول کو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیئے۔ اُس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہونی چاہئیں۔ اگر اس پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے تو لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَہٗ نَذِیْرًا (۲۵/۷) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا اور وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا۔ اس طرح ساری دنیا دیکھ لیتی کہ واقعی اس کی طرف فرشتے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں؟

وہ توہم پرستی کا زمانہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا اُن کے اس بہکاوے میں آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ لوگ حضورؐ کے پاس آتے اور آپ سے کہتے کہ آپؐ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں؟ آپؐ اُن کی اِن باتوں کو صبر و سکون سے سنتے اور ایک

سب سے بڑا معجزہ

تبسم جاں نواز سے ان سے کہتے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویٰ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گذاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریب کار ہوں؟ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے؟

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ وہ معجزہ تھا جس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جاتی تھیں لیکن مفاد پرست گروہ کے دل میں اس سے مخالفت کی آگ اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اب انہوں نے الزام تراشی اور تہمت بافی سے آگے بڑھ کر دست درازی بھی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے اس مخالفت کی تفصیل کو چار لفظوں کے اجمال میں یوں سمٹا دیا ہے کہ وَ اَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ۔ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا (۷۲/۱۹)۔ "اور جب اللہ کا یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔

جوں جوں اُدھر سے مخالفت کی شدت بڑھتی جاتی تھی، خدا کی طرف سے آپؐ کو استقامت اور استقلال کی تاکید زیادہ

استقامت کی تلقین

ہو جاتی تھی کبھی کہا جاتا۔ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۳۸/۱۷) جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں، اس پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۳۰/۶۰) تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخر الامر تمہارا مشن کامیاب ہوگا وہ بالکل سچا ہے۔ اور یاد رکھو، تم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے تم ان مخالفین کی نظروں میں ہلکے ہو جاؤ۔ استقامت سے کام لو، اور ان کی حرکات سے دل برداشتہ ہو کر اپنی اُن کوششوں میں کمی نہ ہونے دو جن سے تم ان لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ وَ ذَکِّرْ بِہٖ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ (۶/۷۰) اور قرآن کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ۔ وَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَ لَا

تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ (۴۲/۱۵)۔ تو اسی طرح انھیں صحیح نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و عزیمت سے اس راہ پر جما رہ۔ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ۔ (۱۰/۱۰۹) جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کئے جاؤ۔ اور اپنی راہ پر استقامت سے قائم رہو۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ۔ (۱۱/۱۱۲) تم بھی اور وہ لوگ بھی جو اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ثابت قدم رہو اور اپنی تگ و تاز کو تیز تر کرتے جاؤ۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ (۲۰/۱۳۰) جو کچھ یہ تیرے خلاف کہتے (اور کرتے) ہیں، تم اس پر ہمت نہ ہارو۔ ثابت قدم رہو۔ اور اپنے نشوونما دینے والے کے پروگرام کو وجہ حمد و ستائش بنا کر دکھلانے میں، پوری تگ و تاز سے کام لو۔ صبح۔ شام۔ راتوں کے اوقات میں۔ اطرافِ نہار میں۔ غرضیکہ دن رات اس پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ جد و جہد رہو۔ تاکہ اس طرح تم اس کے خوشگوار نتائج کو اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔

مفاہمت کی کوشش

جب مخالفین نے دیکھا کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود، اس جماعت کی تگ و تاز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور یہ تحریک آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے۔ تو جیسا کہ بساطِ سیاست کے مہرہ بازوں کا قاعدہ ہے انہوں نے چاہا کہ آپ سے مفاہمت (COMPROMISE) کر لی جائے۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹)۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت برتو۔ اپنے مقام سے تھوڑا سا کھسک جاؤ تو یہ بھی مداہنت سے کام لیں۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں ان لوگوں کی مفاد پرستیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یا تو باہمی مفاہمت سے اس نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام قائم کر لیا جائے، یا قرآنی نظام میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جس سے ان کی مفاد پرستیوں کے لئے کچھ گنجائش نکل آئے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ۔ (۱۰/۱۵) جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس میں ہماری حسبِ منشا تبدیلی کر دو۔ تو پھر ہم آپ سے مصالحت کر لیں گے۔ اس پیشکش کے جواب میں آپ سے کہا گیا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶۸/۸) ان جھٹلانے والوں کی بات ہرگز نہ ماننا۔ وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱۱/۱۱۳) ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ ان سے کہہ دو کہ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵) میری کیا طاقت ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی رد و بدل کر سکوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں اس کا اتباع کروں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اتباع نہ کروں۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک

سخت مصیبت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ـــــ یہ بات کسی ضد کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس لئے تھی کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے تو ارض و سمٰوات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، درہم برہم ہو جائے۔ لہٰذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت ہو نہیں سکتی۔ البتہ ان سے ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس روش پر یہ چل رہے ہیں وہ خوشگواریوں اور کامیابیوں کی روش ہے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ روش تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جانے والی ہے۔ زندگی کی کامرانیوں کا ضامن وہ پروگرام ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ. وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۱/۱۲۱) ان لوگوں سے جو تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے یہ کہو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو اور ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ اس کے بعد تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ حق و صداقت کی راہ کونسی ہے؟

اس کے ساتھ ان سے یہ بھی کہو کہ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ. میں تم سے صرف ایک بات کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى. اور وہ یہ ہے کہ تم زیادہ نہیں تو ایک ایک، دو دو کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا. اور اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر جن میں تم اس وقت اندھا دھند بہے چلے جا رہے ہو، سوچو۔ غور و فکر کرو۔ اگر تم نے خالی الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴/۴۶)۔ تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے بڑی سمجھ بوجھ کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے پر، تمہارا ہی بھلا ہے۔ مَا سَاَلْتُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (۲۵/۵۷) میں تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔

سوچو

اس سے بہت سے سعادت مند افراد نے، رفتہ رفتہ ادھر آنا شروع کر دیا۔ اور اس جماعت میں ترقی ہونی شروع ہو گئی۔ ان کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معاشرہ کا قیام جس میں مفاد پرستوں کی ہوس رانیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، کوئی چھوٹا کام نہ تھا۔ قدوسیوں کا یہ مختصر سا گروہ، دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے جنباں و کوشاں رہتا تھا۔ اس باب میں ان کی شدتِ شوق خود فراموشی تک پہنچ جاتی تھی جسے روکنے کے لئے، خود دستِ قدرت کو اس قافلۂ رشد و ہدایت کے ہدیٰ خواںؐ کی دامن کشی یہ کہہ کر کرنی پڑی تھی کہ يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا. نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (۷۳/۱-۳)۔ راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ نصف شب تک یا اس سے کم و بیش۔ اس لئے کہ ابھی تو آغاز سفر ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا. (۷۳/۵)۔ تجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جانے والی ہے۔ اور اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۷۳/۷) تجھے دن کو کونسا آرام کا وقت مل جاتا ہے۔ اس میں بھی تمہارا پروگرام لمبا

دن رات کا پروگرام

پڑتا ہوتا ہے۔

جوں جوں یہ پروگرام قرارگر ہوتا جارہا تھا، مخالفین کی ایذارسانیاں شدید تر ہوتی جارہی تھیں۔ عام لوگوں کو مخالفین پر غصہ آتا ہے۔ اور ان کے خلاف آتشِ انتقام تیز ہوتی جاتی ہے۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طبیبِ مشفق کو نادان مریض کی بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے دکھ ہوتا ہے، اسی طرح ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا اور اس تصور سے آپ کا دل خون ہو جاتا تھا کہ یہ نادان محض تعصب در جہالت کی

مخالفین سے ہمدردی

سے کس طرح اپنے آپ کو تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔ جذبات کی شدتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں کہ یہ لوگ حق و صداقت کی راہ کو تسلیم کیوں نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لوگے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵/۸) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (۴۲/۴۸) اگر یہ لوگ اس بات سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تمہیں ان کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارے ذمے بس اتنا ہی ہے کہ تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اپنا راستہ آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اپنا کام ہے۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۸۸/۲۱-۲۲)۔ تم انہیں حقیقت کی یاد دہانی کراتے رہو۔ تمہارا فریضہ یاد دہانی کرانا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ وہ وقت آپہنچا جب دیکھ لیا گیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رُو سے صحیح راستہ اختیار کرنا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہو گئے ہیں اور باقی وہ رہ گئے ہیں جن پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا

اعراض

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶) انہیں ان غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ جو شخص خودکشی کرنے پر تُلا بیٹھا ہو، اس سے یہ کہنا کہ دیکھنا راستے میں کھائی ہے، بے کار ہے۔ جو شخص حیوانی سطحِ زندگی (PHYSICAL LIFE) کو زندگی سمجھتا ہے اور انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور باوجود ہر طرح سمجھانے کے لئے، اپنی ضد نہیں چھوڑتا، اسے انسانی سطح کے اصول و قوانین کی تلقین کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ لہٰذا اس مقام پر حضورؐ سے کہا گیا کہ فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (۵۳/۲۹)۔ "سو جو شخص ہمارے قوانین سے روگردانی کرتا ہے اور طبعی زندگی کے علاوہ اور کچھ ارادہ ہی نہیں رکھتا اس سے تم اعراض برتو"۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۴۳/۸۹)۔ ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حرفاً حرفاً ٹھیک تھا۔

لیکن ان مخالفین کا جوشِ انتقام اس کے باوجود ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ وَاِذْ

حضورؐ کے خلاف سازشیں

یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ۔ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ۔ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ (۸/۳۰)۔ (اور اے رسول! وہ وقت یاد کرو جب) مخالفین تیرے خلاف اپنی خفیہ تدبیروں میں لگے ہوئے تھے تاکہ تجھے گرفتار کرلیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور خدا اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اور (یہ ظاہر ہے کہ) خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

ہجرت

چنانچہ اس تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں کی فضا کے متعلق علم تھا کہ وہ نظام خداوندی کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ ہجرت سے یہی مقصود ہوتا ہے۔ اسی لئے مکہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر یہ دعائیں تھیں کہ (وَقُلْ) رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۱۷/۸۰) اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔

آپؐ اس حالت میں مکہ سے نکلے کہ صرف ایک رفیق ہمراہ تھا۔ لیکن اس (بظاہر) بیکسی اور بے بسی کے عالم میں بھی اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقینِ محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرما رہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰) مت گھبراؤ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ سے آنے والے مسلمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور یوں ایک ایسی برادری کا وجود عمل میں آیا جو خون۔ رنگ۔ وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر محض آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر تشکل ہوئی تھی اور جس کے متعلق

ایک نئی برادری

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تصدیق عطا ہوئی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۲)۔ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی۔ تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔

اب (بظاہر) مخالفین کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن انھیں معلوم تھا کہ اگر وہ نظام جس کی طرف نبی اکرمؐ دعوت دیتے تھے کسی ایک مقام میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے حیات بخش نتائج کو دیکھ کر دوسرے مقامات کے لوگ اس کی طرف لپک کر بڑھیں گے اور یوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے اس جماعت کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور لڑائی کے لئے امنڈ آئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر سی جماعت کو جنگ کی

جنگ کی اجازت اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا۔ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ ان مظلوموں کو (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دشمن امڈ آئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ انھیں جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ (جو لوگ دوسروں پر زیادتی کرنے کی غرض سے چڑھ دوڑتے ہیں) ان کی مدافعت (دوسرے انسان کریں) تو اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہو کہ دنیا میں مذہب کی آزادی ختم ہو جائے اور نہ راہبوں کی کوٹھڑیاں باقی رہیں نہ عیسائیوں کے گرجے۔ نہ یہودیوں کے معبد سلامت رہیں نہ مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اس کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا پروگرام وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ سو جو شخص اس پروگرام کی تکمیل میں خدا کی مدد کرے گا، خدا اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے ـــــ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مظلوم جنھیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر غالب آ گئے اور انھوں نے اپنی حکومت قائم کر لی، تو ان کی حکومت، دوسرے ارباب اقتدار سے کس طرح مختلف ہوگی۔ فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱-۳۹)۔

اسلامی مملکت کا مقصد یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظام صلوٰۃ کو قائم کریں گے۔ نوع انسان کی پرورش کا انتظام کریں گے۔ لوگوں کو قوانین خداوندی کی اطاعت کا حکم دیں گے اور غیر خداوندی قوانین کی اطاعت سے روکیں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور آخر الامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

اس مقصد کے لئے انھیں جنگ کی اجازت دی گئی۔ دونوں جماعتوں کا آمنا سامنا بدر کے مقام پر ہوا (۳/۱۲۳) مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود نبی اکرمؐ کر رہے تھے۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور مظلومین کی یہ جماعت جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی، فاتح و منصور واپس لوٹی۔

شکست خوردہ مخالفین نے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ ان بے گناہ مسلمانوں سے لینا شروع کر دیا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ نہیں آنے پائے تھے۔ یہ مظلوم اپنی مدد کے لئے مدینہ کے مسلمانوں کے علاوہ اور کسے پکار سکتے تھے؟ ان کی مدد ان پر لازم تھی۔ اور اگر اس کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو جنگ بھی کی جا سکتی تھی۔ یعنی ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ

مظلوموں کی امداد خواہ وہ ظلم کہیں ہو رہا ہو۔ اس لئے کیا گیا کہ وَ مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ

لِلّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۔ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (۴/۷۵) (مسلمانو!) تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرو' ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے جو (چیخ چیخ کر) پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے بسنے والے اس قدر ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی پشت پناہ بنا اور اپنے حضور سے ہمارا کوئی مددگار بھیج۔

فرائضِ رسالت

لڑائیوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک مسلسل رہا تا آنکہ (آخرالامر) مکہ فتح ہو گیا۔ اور یوں ہر طرف دینِ خداوندی غالب آگیا۔ اس دوران میں آپؐ اس نظامِ نو کی تشکیل اور اس کے مختلف گوشوں کی تعمیر و تحسین کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس پروگرام کی متعدد شقیں تھیں۔ مثلاً

(۱) سب سے پہلی شق یہ کہ جو کچھ آپؐ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا سے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا کہ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۵/۶۷)۔ اے رسول! جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے۔

(۲) لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)۔ یہ رسول لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ انہیں قوانینِ الٰہیہ اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) خود قرآن کریم کا اتباع کرنا (۶/۵۰) اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷/۳) جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو۔

(۴) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کرنا۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹)۔ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلے کر۔ اس لئے کہ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

(۵) امورِ مملکت کے فیصلے اپنی جماعت کے مشورے کے ساتھ سرانجام دینا۔ اس کے لئے حکمِ خداوندی تھا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۸) اے رسول! تو معاملات میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر۔ اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے، معاملہ پیشِ نظر کی سرانجام دہی

کے لئے عمل پیرا ہو جا۔ اس جماعت کی اہمیت اور قدر و منزلت کو، خدائے بزرگ و برتر نے ان وجد آفریں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جماعتِ مومنین

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ
بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ
فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي
الْاِنْجِيْلِ۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ
يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹)

محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھ قدوسیوں کی جماعت، جن کی خصوصیت یہ ہے کہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت لیکن باہمدگر سراپا رأفت و محبت ہیں۔ وہ دنیا میں کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے۔ جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اسی سے وہ فضل و عنایات کے خواہاں اور اسی کی رضا جوئی کے طالب۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے ان کے دل میں اطمینان و سکون اور شادابی و شگفتگی کی جو جنت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہی ہے قدوسیوں کی وہ جماعت جس کے تذکرے تورات وانجیل میں آ چکے ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ حق و صداقت کی لہلہاتی کھیتی ہے۔ شروع میں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ایمان کی زمینِ صالح سے اعمال کا تخم حسنہ نرم و نازک پتی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخِ نودمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو وہ ایک سرسبز و شاداب کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے حفاظت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں اس جماعت کے ساتھ کئے تھے اور جنہیں اس کی شانِ ربوبیت نے اس حسن و رعنائی سے پورا کیا۔

ذرا جماعتِ مومنین کی اس خصوصیت کبریٰ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ اقبال کے الفاظ میں

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رَو، کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان امور میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے طے پا جائیں ان میں انسانوں سے مشورہ کے کیا معنی؟ یہ امور وحی کے قوانین کی روشنی

ہیں، زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ عقل و فکر کی رُو سے طے کئے جاتے تھے جس میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ اس کے لئے واضح

غلطی کا امکان

الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ۔ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰) ان سے کہدو کہ میں اگر کبھی غلطی کر جاتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے اور جب میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے ـــــ جو کچھ وحی کی رُو سے ملے ہوتا تھا، اس میں نہ رسول اللہ کو کسی قسم کا اختیار ہوتا تھا اور نہ جماعتِ مومنین کو۔ لیکن جامد و ذاتی رائے پر چھوڑ دیئے جاتے تھے ان میں لوگوں کو ایسی آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر و عمل حاصل تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی آزادیٔ فکر و اظہار کا نتیجہ تھا کہ ایک عام

آزادیٔ فکر

عورت تک اپنے معاملہ میں حضورؐ کے ساتھ پوری جرأت کے ساتھ جھگڑ سکتی تھی۔ ایسی جرأت جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا۔ وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸/۱) اللہ نے اس عورت کی بات کو سُن لیا جو تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی۔ اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سُن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا۔ جاننے والا ہے ـــــ اور جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)۔ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔ اسے طلاق مت دے۔ تو انہوں نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور بیوی کو طلاق دیدی۔ اس سے نہ مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال پیدا ہوا، نہ مشورہ سے انکار کر دینے والے کے دل میں کسی قسم کا خیال۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ نوعِ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے علاوہ ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی جائے۔ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ اس رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسانوں کے سر سے وہ بوجھ اتار دے جن میں وہ دبے ہوئے تھے۔ اور انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرا دے جن میں وہ جکڑے چلے آ رہے تھے۔ تیئس سال کی مسلسل جدوجہد سے آپؐ نے وہ فضا پیدا کر دی جس میں ہر انسان پوری پوری آزادی کا سانس لے رہا تھا اور علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا تھا کہ وہ سوائے قوانینِ خداوندی کے کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے ابھر آگئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے کتاب اور حکومت اور نبوت لے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب خداوندی کی رُو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو اپنے رب کے نیک بن جاؤ۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے آپؐ بار بار اس کا

بشریت

اعلان فرماتے تھے کہ (قُلْ) اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۔ (۱۸/۱۱۰) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے۔ اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ (۶/۵۰)

اس طرح رفتہ رفتہ دین کی تکمیل ہوگئی اور خدا نے اعلان کر دیا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)۔ اور تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انھیں کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا۔ جاننے والا ہے۔ خدا کی یہ باتیں جو اس نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے دی تھیں، قرآن کریم میں جمع ہوگئیں جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) یقیناً ہمیں نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپ کی حیاتِ طبیعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (۳۹/۳۰) اور جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ حضورؐ کی وفات سے اس

حضورؐ کے بعد

نظام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آسکتا جسے آپ نے وحیِ خداوندی کی روشنی میں تشکیل فرمایا ہے۔ یاد رکھو وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ محمدؐ بجز اس نیست کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ آپ سے پہلے بھی خدا کے کئی رسول آئے اور گذر گئے۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ سو اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف آپؐ کی ذات تک محدود تھا، اپنے پچھلے نظام کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا (۳/۱۴۳) جو تم میں سے الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷)۔ وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے جنھیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنھیں قرآن نے ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہی فریضہ تمہارا ہوگا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹)۔ تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انھیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اُس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ...... (۳۵/۳۲) لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ

علیٰ خلق عظیم

تمہارے رسول نے یہ کچھ اس لئے کرکے دکھا دیا تھا کہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) اس لئے تمہیں بھی بلند ترین اخلاق کا حامل ہونا ہوگا۔ اس باب میں رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)

اس کا (TEST) اور معیار یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ بھرے مجمع میں مخالفین سے کہتے تھے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)۔ میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں! اسی طرح تم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کے سامنے سینہ تان کر اس کا دعویٰ کر سکیگا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ وہی رسول اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہوگا اور اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں یہ نظام آگے بڑھے گا۔ نبی اکرمؐ کے خُلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپؐ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا، دنیا کے بڑے بڑے مورخین اور مفکرین اس باب میں رطب اللسان ہیں۔ اور (LAMARTINE) کے الفاظ میں بآوازِ بلند کہتے ہیں کہ

> ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ ــــ کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی پیدا ہوا ہے؟ (معراج انسانیت ص۳۳۲)

یہ ہیں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ قرآن کریم میں اس زریں داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن ہم نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے۔ یہی حضورؐ کی وہ سیرتِ مقدسہ ہے جس کے حرفاً حرفاً سچا ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) باقی ہے تاریخی واقعات۔ سو ظاہر ہے کہ ان میں وہی سچے قرار پا سکتے ہیں جو حضورؐ کی سیرتِ قرآنیہ کے مطابق ہوں۔ یہی وہ حسنِ سیرت اور رعنائی کردار ہے جس کے پیشِ نظر خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامی پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

صرف حضورؐ پر ہی نہیں بلکہ اس جماعتِ مومنین پر بھی جو حضورؐ کے اتباع میں نظامِ خداوندی کے قیام کا باعث بنتی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳/۴۳)

دنیا کے مشکل ترین مسئلہ ــ **تقدیر** ــ کا قابلِ فہم اور بصیرت افروز حل

قرآن کریم کی روشنی میں

کتاب التقدیر

محترم پرویز صاحبؒ کی کتاب

قیمت ۶۰/- روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

"طلوعِ اسلام سیمینار ۱۹۹۰ء" بسلسلہ گولڈن جوبلی قراردادِ پاکستان (لاہور)

محترم اکبر سعید صاحب کا مقالہ جو قلتِ وقت کی وجہ سے سیمینار میں پڑھا نہ جا سکا۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی

جنابِ صدر و معزز احبابِ کرام!

آج جو موضوع وجہِ کلام بن رہا ہے اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

"حقیقت خرافات میں کھو گئی"

یہ موضوع جتنا جگر خراش ہے، اتنا ہی عبرتناک بھی ہے۔ کیونکہ حقیقت کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی چیز اس طرح اپنی جگہ پہ جم کر کھڑی ہو کہ اس کے وجود سے انکار، اس کے ثابت ہونے سے چشم پوشی اور اس کی سچائی سے مُنہ نہ موڑا جا سکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اتنی مضبوط، مینارۂ روشنی کی طرح بلند اور مستحکم حقیقت خرافات کی دلدل میں جا پھنسی۔

جنابِ والا! یہ داستانِ رنج و الم محدود وقت میں تو بیان نہیں کی جا سکتی کہ اس کی بساط صدیوں تک اور اس کا عرصہ قرنوں تک پھیلا ہُوا ہے۔ لیکن آدابِ محفل کا خیال بھی بڑی شدّت سے دامن تھامے ہوئے ہے۔ اس لئے کوشش کروں گا کہ آپ کے عطا کردہ وقت میں ہی دِل کی بات زباں تک لے آؤں اس سعی و کاوش میں اگر کچھ پہلو تشنہ رہ جائیں تو میری علمی تہی دامنی جان کر معاف فرمائیے گا۔

معزز حاضرین! حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کیلئے آپ قوموں کی تاریخ میں خارہ شگافی کریں یا اجڑی ہوئی بستیوں کے حسرت زدہ کھنڈروں سے پوچھیں! لیلائے زندگی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔ تہذیب کی کہن سال راہبہ سے دریافت کریں یا تمدّن کے خاموش اور پُراسرار سمندر میں اتر کر یہ گوہرِ نایاب تلاش کریں! آپ کو ایک ہی جواب ملے گا جو بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے:

لا الٰہ الا اللہ

کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا حاکم نہیں بن سکتا۔ یعنی رُوحِ انسانی کی حرّیت و حرمت کو پابندِ سلاسل کرنے کا انسانوں کو کوئی حق نہیں ہے

جنابِ صدر! یہ تو تھی حقیقت کہ جس تک عقلِ انسانی پہنچی تو ضرور، اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے وحی کی

روشنی و راہنمائی میسر آگئی اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ وَاَطِیْعُوْنِ (۷۱/۳)

یہی وہ صدائے حق تھی جو حضرت نوحؑ نے کوہِ آئین سے حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور سے، حضرت عیسیٰؑ نے کوہِ زیتون سے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاران کی چوٹیوں سے بلند کی۔

خود ساختہ خداؤں کی چکی میں پسے ہوئے طبقات دیوانہ وار اس آواز کے پیچھے لپکے کہ خدائے واحد کی اطاعت و بندگی، ان کو باطل خداؤں سے چھٹکارا دینے والی تھی۔ معاشرے کے محرومیوں میں جکڑے ہوئے لوگوں نے اِلٰہٌ وَّاحِد کو اپنا سہارا جانا۔ بیستانِ حیات میں بہار مسکرانے لگی، امیدوں کے پھول اور امنگوں کی کلیاں انسانیت کی راہوں میں خوشبو بکھیرنے لگے، کاروانِ ہستی کی منزل کا تعین ہوا اور بھٹکے ہوئے نفوس نے اپنی راہ پہچانی۔

جنابِ والا! حضرت نوح علیہ السلام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک خدائے لم یزل کے ہزاروں رسول اپنے اپنے زمانے میں اسی حقیقت کی روشنی بکھیرتے رہے اور انسانیت کی راہوں میں حق و صداقت کے چراغ جلاتے رہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶)

آپ دیکھیں گے کہ ہر بار مخالفت معاشرے کے ان طبقات کی طرف سے ہوئی جنھیں مراعات یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ غرور و تکبر ان کی ذہنیت میں اس حد تک داخل ہوتا ہے کہ عام انسانوں کے متعلق ان کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ نہایت بے وقوف اور گھٹیا لوگ ہیں جب ان کے سامنے تعلیمِ حقیقت پیش کی جاتی ہے تو بقول قرآن ان کا جواب یہ ہوتا ہے:

قالوا انؤمن کما اٰمن السفھاء

جنابِ صدر! یہی وہ لوگ تھے جو دولت کے سرچشموں پر قابض تھے۔ معاشی وسائل ان کے پنجۂ استبداد میں تھے اور اپنے اپنے دور کے لحاظ سے تمام ذرائع ابلاغ پر انہی کا تسلط تھا اور، حاضرینِ کرام! یہیں سے وہ المناک داستان شروع ہوتی ہے جو آج کا عنوان ہے۔ ان کی مخالفت کی وجہ کسی بھی دور میں نماز روزہ یا دیگر عبادات نہیں تھیں بلکہ ان کا انکار توحید، وحدتِ انسانی، اخوت و مساوات کی تعلیم اور سماجی دائرے میں اپنے مقام و مرتبہ کو چیلنج کرنے والی تبدیلی کا انکار تھا۔

جنابِ والا! میرے اس اجمالی بیان کے بعد اب ہمیں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھنا ہے کہ انکشافِ حقیقت کرنے والے آخری دینِ اسلام کے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ایک ایسا دین جو انسانیت کی سربلندی کا نعرہ لے کر اٹھا تھا کارزارِ حیات میں عضوِ معطل بن کر رہ گیا؟ وہ دین جس کی بنیادی تعلیم اور

مقصد خدائے واحد کی حکمرانی تھی جس نے باطل خداؤں کی زنجیروں میں جکڑی دنیا کو آزادی دلوانا تھی کیوں چودہ سو سال پہلے کے عرب معاشرے کی روایات پر مبنی زکوٰۃ و عشر کی در آمد سے آگے نہیں بڑھا؟

معززّ حاضرین! اس کی سب سے بڑی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو کہ جسے بنیاد بنا کر ایک ایسا نظام متشکل ہونا تھا جس میں حقیقت منتظر لباسِ مجاز میں نظر آتی۔ سبز غلافوں میں لپیٹ کر اونچے طاق پر رکھ دیا گیا۔ دراصل ایک خاص ذہنیت والا طبقہ شروع سے ہی موجود رہا ہے کہ جس پر نفاذِ حقیقت کا نام سنتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ان کو مترفین کہہ کر پکارا ہے یعنی دوسروں کی کمائی اور محنت پر عیش کرنے والے، اور ذرا غور سے آپ پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ ایک طبقہ تین قسم کی اجارہ داری کا حامل ہے یعنی سرمایہ، حکومت اور مذہب اور یہ مثلث کبھی بھی حقیقت کو بے نقاب نہیں دیکھ سکتی، کیونکہ اعترافِ حقیقت کا مطلب براہِ راست ان کے مفادات و مقاصد کی تباہ کاری تھی۔

جنابِ صدر! اسلام کے ابتدائی سال اس طبقے کے لئے ساز گار نہ تھے ایک انقلاب جنم لے رہا تھا، جس کے آگے کوئی چیز بھی نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ ایک معاشرہ متشکل ہو رہا تھا جس میں حقیقتِ ابدی بہ تمام و کمال جلوہ افروز تھی۔ بدقسمتی سے خلفائے راشدین کے بعد ریاستی عمل میں وہ تبدیلیاں نہ لائی جا سکیں جو ارتقائی عمل کا حصہ تھیں اور جن پر نظامِ حقیقت کی عظیم الشّان عمارت استوار ہونا تھی اور جونہی اس عملِ ارتقاء میں خلاء آیا۔ وہ طبقہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اپنے تمام ساز و سامان سے لیس ہو کر میدانِ عمل میں اتر آیا اور تین اطراف سے اس پر یلغار کی۔ قرآن کا ارشاد حکومتِ الٰہی کے قیام کے بارے میں بہت واضح تھا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

لیکن اس کے متعلق یہ کہا گیا کہ جس نے مسلمانوں میں سے ہوسِ ریاست و حکومت کی وہ ہلاک ہو گیا ——— (الشافی جلد دوم) ——— اس طرح حکومت کرنا صرف بادشاہوں کا فریضہ ہی رہ گیا اور عوام النّاس کی حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہ رہی۔

کتابِ حکمت میں سرمائے کی گردش کے متعلق بہت روشن احکام ہیں اور اسے ایک ہی جگہ جمع کرنے والوں کو دردناک انجام کی نوید ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

اور یہاں اڑھائی فیصد والی زکوٰۃ کا مژدۂ جانفزا سنا کر حقیقت کو ڈھانپ دیا۔ اب باقی رہ گیا دین سو اس کو مذہبی پیشوائیت نے اپنی آغوش میں لے کر روایات و خرافات کی ایسی چادر تان دی کہ اس کو ہاتھ لگانا بھی کفر قرار پا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

اور حاضرینِ کرام! اس طرح یہ تکونی طبقہ کسی نہ کسی شکل میں لباس بدل بدل الناس اور حقیقت کے درمیان دیوار بنا کھڑا ہے۔

صاحبِ صدر! میں نے صرف ان چند بنیادی عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے حقیقت کو ڈھانپ رکھا ہے کیونکہ بعد میں جتنی بھی تفاصیل ہیں وہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ قانونِ خداوندی کی حکمرانی جو بنیادی حقیقت ہے اسے کون کون سے لبادے پہنانے کی کوشش کی گئی۔ اس ساری صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے عام ذہنوں میں جو تصور ابھرتا ہے وہ کوئی زیادہ خوش آئند نہیں کیونکہ اکثریت اس پیش کردہ مذہب کو ہی حقیقت سمجھ کر اس سے بیزار ہو چکی ہے اور ان کے دلوں میں یہ خیال، جاگزیں ہو چکا ہے کہ قرآن عصرِ حاضر کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب حقیقت کو صرف جھاڑ پھونک تک ہی محدود کر دیا گیا ہے اور پڑھ کر الفاظ کی نیکیاں حاصل کرنے کو ہی مقصدِ حیات قرار دے دیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر کتابِ حقیقت اور کیا ہوگا کہ ایسی زندہ و جاوید کتاب کہ جس نے مشعلِ راہ بن کر حقیقت تک پہنچانا تھا طاقِ نسیاں پہ دھری ہوئی ہے اور میرے ذہن میں علامہ اقبالؒ کا یہ فقرہ گونج رہا ہے کہ:

"قرآن عصرِ حاضر کی سب سے مظلوم کتاب ہے"

آخر میں ان الفاظ کے ساتھ آپ سے اجازت چاہوں گا:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارہ شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی

مطبوعات کی قیمتیں اکتوبر ۱۹۹۰ء

نوٹ : اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ کھلے پارے)	۱۵۰/۰۰ روپے
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	۶/۰۰ "
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (فی پارہ)	۵/۰۰ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۱۷۰/۰۰ "
(تین جلدوں میں۔ فی جلد)	۶۰/۰۰ "
لغات القرآن۔ (مکمل سیٹ مجلد۔ ایک جلد میں)	۲۸۵/۰۰ "
چار جلدوں میں (فی جلد -/۷۵)	۳۰۰/۰۰ "
تبویب القرآن۔ تازہ ایڈیشن (تین جلدوں میں)	۲۵۰/۰۰ "
ایک جلد میں	۲۴۰/۰۰ "
مطالب الفرقان - چھ جلدیں	۴۶۵/۰۰ "
(جلد اول، دوم۔ تازہ ایڈیشن۔ جلد سوم) ہر جلد	۷۵/۰۰ "
مطالب الفرقان - جلد چہارم	۹۰/۰۰ "
مطالب الفرقان۔ جلد پنجم و ششم (ہر جلد)	۷۵/۰۰ "
من و یزداں (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
جوئے نور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
برقِ طور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ روپے
شعلۂ مستور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
معراجِ انسانیت (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں (اعلیٰ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۲۰/۰۰ "
اِنسان نے کیا سوچا؟ (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
اِسلام کیا ہے ؟ (تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
کتابُ التقدیر (تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
جہانِ فردا	۴۵/۰۰ "
شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
نظامِ ربوبیت (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۲۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۴۰/۰۰ "
تصوف کی حقیقت	۶۰/۰۰ "
قرآنی قوانین (ڈیلکس ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۰/۰۰ "
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	۸۵/۰۰ "
(جلد اول ۴۰ روپے، دوم -/۲۰ روپے جلد سوم	۲۵/۰۰ ")

نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط (ڈیلکس ایڈیشن)	۶۰/.. روپے
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۲/.. «
اسلامی معاشرت	
مقامِ حدیث (تازہ ایڈیشن)	« ۱۰/..
قرآنی فیصلے جلد اول (سابقہ اول، دوم، سوم)	« ۶۰/..
جلد چہارم، پنجم (فی جلد)	« ۱۳/..
ختمِ نبوتؐ اور تحریکِ احمدیت	« ۴۵/..
حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (تازہ ایڈیشن)	« ۱۲/..
تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ (ڈیلکس ایڈیشن)	« ۲۵۰/..
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	« ۷۰/..
نوادرات۔ مجلّد	« ۷۵/..
پیپر بیک	« ۶۰/..
اسبابِ زوالِ اُمت	« ۳/..
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	« ۸/..
اقبالؒ اور قرآن۔ جلد اول (ڈیلکس ایڈیشن)	« ۴۵/..
جلد دوم (ڈیلکس ایڈیشن)	« ۷۰/..
پرنسپلز آف لا میکنگ اِن اِسلام (انگریزی)	« ۶/..
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION DELUXE	« 100/-
STUDENT	« 35/-
EXPOSITION OF The Holy QURAN	Rs.200/-
ISLAMIC WAY OF LIVING	« 25/-

نام کتاب	قیمت
مطبوعاتِ النور پرنٹرز	
قبلۂ اوّل	۴۵/.. روپے
لِسان القرآن	« ۳۵/..
وطن کی مٹی گواہ رہنا	« ۵۰/..
تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل	« ۱۲۰/..
عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر	« ۱۵۰/..
تاریخِ پنجاب اور افاغنۂ قصور کا کردار	« ۱۴۰/..
معجم المفہرس (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	« ۲۰۰/..
(اعلیٰ «)	« ۴۰۰/..
پاکستان کے انکم ٹیکس قانون کی تفصیلات سٹوڈنٹ	« ۲۰۰/..
PRACTICAL HANDBOOK OF INCOME TAX PROFESSIONAL EDITION	« ۵۰۰/..
تصنیفات ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN	« 84/-
THE HEAVENS, THE EARTH & THE QURAN	« 84/-
QURANOCRACY NOT DEMOCRACY	Rs.50/-
FOOD AND HYGIENE IN ISLAM	« 9/-
GATEWAY TO THE QURAN	« 54/-
CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN	——
مظاہرِ فطرت اور قرآن	« ۱۳۲/..

کتابیں ملنے کے پتے: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پاکستان۔ فون ۸۷۹۲۳۶ * مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار، لاہور، پاکستان

حقائق و عبر

داعیانِ دین کی داستانِ عبرت

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بیٹے کا ایک خط اخبارات میں شائع ہُوا ہے، جس میں انہوں نے نہ صرف جماعت کے لیڈروں پر بددیانتی، بدمعاملگی اور شکم پرستی کے الزامات عائد کئے ہیں بلکہ ایسے انکشافات بھی کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خود جماعت کے بانی کے ساتھ انہوں نے کیا کیا دھوکے نہیں کئے۔ خط خاصا طویل ہے جسے سارے کا سارا نقل کرنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں تاہم صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لئے اس کا ایک آدھ پیراگراف ہی کافی ہوگا۔

> " کہنے کو دِل تو نہیں چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرکز کی قیادت سے والبتہ ان حضرات نے تحریکِ اقامت دین کو تحریکِ اقامتِ شکم بنا دیا ہے "
>
> میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ یہ اصول (ہر وصولی کی رسید کا اجراء) توڑا جا چکا ہے۔ بیرونِ ملک ہمدردوں سے جو اعانتیں بڑی مقدار میں وصول ہوتی ہیں، وہ سب اس اصول کو توڑ کر آتی ہیں اور یہی جماعت کے بجٹ کا بڑا حصّہ پُورا کرتی ہیں۔ ان رقوم کے نتیجہ میں جماعت کے مرکزی قیادت کے یہ لوگ اخلاق و کردار کے بُحران میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ یہ رقوم غیر قانونی طریقہ سے مرکز میں پہنچتی ہیں جو صریح طور پر جرم ہے اور جُرم سے متعدّد قباحتیں جماعت میں پیدا ہو رہی ہیں۔"
>
> (ہفت روزہ 'ندا' لاہور بابت ۲۸ اگست ۱۹۹۰ء ص ۱۳)

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر 'ندا' لکھتے ہیں :۔

" جماعت کا اب جو حال ہے اور منصورہ میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا کچھ اندازہ

تو ہمیں ہے لیکن اللہ شاہد ہے کہ یہ خیال نہ تھا کہ خود مولانا کی زندگی میں وہاں جوتیوں میں دال ایسے بٹنی شروع ہوگئی تھی اور چھینا جھپٹی کا یہ عالم تھا۔ دینی تحریکیں جب اخلاقی انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں تو پستی کی طرف لڑھکنے کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جو فطرت کے طبعی اصول کے عین مطابق ہے۔ اس المناک روداد کو پڑھ کر قیاس کیجئے کہ پوت کے کرتوت پالنے میں وہ تھے جن کی جھلک اس خط میں ملتی ہے تو اب شباب کون سی قیامت نہ ڈھا رہا ہوگا۔ ہمیں عمر کے آخری حصے میں مولانا مرحوم کی بے بسی کا حال پڑھ کر جو صدمہ ہوا، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں لیکن اس کہانی سے دینی تحریکوں کے لئے کچھ سبق بھی ملے جن کی طرف آخر میں اشارہ کیا جائے گا۔ عاقلاں را اشارہ کافی است"

(ایضاً۔ صفحات ۱۱، ۱۲)

جمہوریّت اور اسلام

فرقہ اہلحدیث کے اخبارات و رسائل میں ان دنوں جمہوریّت کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی جارہی ہے۔ ہر رسالے میں ایک ہی قسم کے دلائل دیئے جارہے ہیں۔ مثلاً ہفت روزہ الاعتصام بابت ۲۴ اگست ۱۹۹۰ء کے پہلے صفحہ کی پہلی سطر میں کہا گیا ہے کہ :-

"مغربی جمہوریّت اور انتخابات کے بارے میں علیٰ وجہ البصیرت ہم یہ رائے رکھتے ہیں، جس کا ہم متعدد مرتبہ اظہار کرچکے ہیں، کہ یہ نظام جس میں بندوں کو تولنے کی بجائے گنا جاتا ہے، اسلامی ملکوں کے لئے سخت تباہ کن ہے۔"

اسی طرح صـ۶ پر عمر فاروق صاحب، رقمطراز ہیں :-

"دورِ حاضر میں جمہوری نظامِ حکومت کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ "لوگوں کی حکومت، لوگوں کے ذریعہ، لوگوں کیلئے"، مگر اسلام کا نظریۂ حکومت یہ ہے "اللہ کی حکومت، اللہ کے نیک بندوں کے ذریعہ، اللہ کے بندوں پر"

ایسا کہتے وقت یہ حضرات یہ نہیں بتاتے کہ یہ اللہ تعالےٰ کے نیک بندے کون ہونگے اور انہیں کس طرح منتخب کیا جائے گا۔ نیک بندوں سے انکی مراد اگر علمائے کرام ہیں، جنہوں نے اپنی الگ الگ جماعتیں قائم

کر رکھی ہیں تو اللہ ہی حفاظت کر سکتا ہے اس ملک کی۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے اشارے پر سُود جیسی حرام چیز کے جواز کا فتویٰ جاری کر دیا تھا

تاریخِ پاکستان ـــــ راویوں کی زد میں

فرقہ اہلحدیث کے ترجمان پندرہ روزہ اخبار المنبر نے اپنی ۸ ـــ ۲۲ اگست کی اشاعت میں "جنرل محمد ضیاء الحق کی اپنے فوجی منصب سے اسلام کی بلندیوں تک قابلِ رشک پرواز" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"شہیدِ اسلام نے حضور سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بدترین جُرم "دعوی نبوت کاذبہ" کے خلاف السدادِ قادیانیت آرڈی ننس کے نفاذ کے بعد تاریخ کا یہ شاندار واقعہ رونما ہُوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پوتے اور خلیفہ نے اپنے دعوے کے مطابق آسمان سے منظور شدہ مرکز کو خیرباد کہا اور بوریا بستر لپیٹ کر وہ کافر حکومت کے مرکز میں چلے گئے اور اب تک انہیں واپس لوٹنے کی ہمت نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز"

اہلحدیث کا یہ مؤقر جریدہ اعلیٰ پایہ کی جس اسلامی خدمت کو جنرل ضیاء الحق مرحوم کے کھاتہ میں ڈال رہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزائیوں کو کافر قرار دینے کا قانون پہلی بار ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے کئی روز کی بحث کے بعد منظور کیا تھا۔ اس میں قادیانی خلیفہ کو بھی خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی

ضیاء الحق صاحب نے برسرِ اقتدار آتے ہی اس قانون کو منسوخ کر دیا تھا۔ لیکن جب ہر طرف سے ان کے خلاف شور مچا، بلکہ خود ان پر مرزائی ہونے کا شُبہ ظاہر کیا گیا۔ تو انہوں نے اسی قانون کو دوبارہ آرڈی ننس کی شکل میں نافذ کر دیا۔ فرقہ اہلحدیث کے لوگ اگر اسے اسلام کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں تو انہیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ خدمت ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے سرانجام دی تھی نہ کہ جنرل ضیاء الحق نے!

علمائے اہلِ حدیث

ہفت روزہ الاعتصام۔لاہور کی ۳۱۔اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں "یادِ رفتگان" کے عنوان سے مولانا یٰسین ظفر، مدیر التعلیم جامعہ سلفیہ فیصل آباد، اپنے ہم مسلک پروفیسر غلام احمد حریری مرحوم

کو ان کی وفات پر، خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"پروفیسر غلام احمد حریری صاحب مرحوم، پاکستان میں نصابِ تعلیم کے معمار ہیں۔اور ایک ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت سے انہوں نے قومی سطح پر خدمات سرانجام دیں ان کی تصنیف کردہ اسلامیات اور عربی کی کتب اس وقت بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں اور نئی نسل کی تربیت اور اسلامی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں کسی قوم کے لئے نہ صرف نصابِ تعلیم مرتب کرنا بلکہ موجودہ حالات کے تقاضوں کے عین مطابق انہیں کتب تصنیف کر کے مہیا کرنا کیا معمولی کارنامہ ہے ؟ اور اسے قومی سطح پر خدمت شمار نہ کرنا کتنی زیادتی ہے۔ حقیقت میں آپ کی زندگی کا نمایاں اور روشن پہلو نصابِ تعلیم کے سلسلے میں آپ کی خدمات ہیں۔"

طلوعِ اسلام

ہمیں نہ تو پروفیسر حریری صاحب کی ذات سے کوئی سروکار ہے نہ انکی فکر سے کوئی واسطہ لیکن فاضل مضمون نگار نے جس دیدہ دلیری سے پروفیسر مرحوم کو ایک جیّد عالم اور پاکستان میں نصابِ تعلیم کا معمار ظاہر کیا ہے اس کے پیشِ نظر، ریکارڈ کی درستی کے لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ تصویر کا اصل رُخ بھی پیش کر دیا جائے۔

پروفیسر حریری صاحب کو پاکستان میں نظامِ تعلیم کا معمار قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ نصابِ تعلیم کی تدوین کسی ایک فرد کی مرہونِ منت نہیں ہوتی اس میں مُلک کے مختلف گوشوں سے درجنوں ماہرین تعلیم حصّہ لیتے ہیں، مختلف موضوعات اور درجات کے لئے کئی کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں اور پھر طویل بحث و تمحیص کے بعد نصابِ تعلیم وجود پذیر ہوتا ہے۔ فاضل مضمون نگار یا تو اس عمل سے واقف نہیں یا پھر وہ "من ترا حاجی بگویم" کے مصداق حریری صاحب کی ثنا خوانی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے حریری صاحب نہ تو کسی کمیٹی کے رکن تھے اور نہ ہی ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے شائع کردہ اسلامیات کی کسی کتاب میں ان کا ذکر ہے، ہاں البتہ انہوں نے کالجوں کے لئے اسلامیات کی درسی کتابوں کے خلاصے ضرور لکھے ہیں۔ جو قانوناً جُرم ہونے کے علاوہ علمی دنیا میں پروفیسر صاحب مرحوم کی تہی دامانی کے مظہر ہیں۔

پروفیسر حریری صاحب کو ماہرِ تعلیم ثابت کرنے والے یہ اہلحدیث اہلِ قلم غالباً انہی خلاصوں کو اسلامیات

کی کتابیں سمجھ رہے ہیں۔

بطور اہل حدیث پروفیسر صاحب زندگی بھر اپنے آپ کو تقلید کے دشمن ظاہر کرتے رہے لیکن خود اس سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ مثال کے طور پر خلاصہ مذکور میں "درود" کی عبارت جو انہوں نے بار بار لکھی ہے، وہی ہے جسے اہل تشیع حضرات عقیدتاً اور سنی حضرات سہواً استعمال کرتے ہیں۔ حدیث کی رُو سے درود کی اصل عبارت "صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔ شیعہ حضرات "وسلم" سے پہلے اس میں "آلہٖ" کا اضافہ کرتے ہیں۔ گرامر کی رُو سے "علیہ" چونکہ اسم ضمیر ہے اس لئے ظاہر ہے "آلہٖ" کا اضافہ مقصود ہو تو اس سے پہلے حرفِ جار "علیٰ" کا استعمال ضروری ہے۔ ورنہ اس سے نبی اور آلِ نبی میں کوئی فرق نہیں رہتا جو خلافِ واقعہ ہونے کے علاوہ عقیدۂ ختمِ نبوت کی بھی نفی کرتا ہے۔ عربی گرامر کے امام، سیبویہ نے بھی درود کی یہی تشریح فرمائی ہے (جامع الاحکام القرآن۔ جلد ۵ صـ۳) پروفیسر حریری مرحوم اور ان کے ہمنوا علماء کا استدلال یہ رہا ہے کہ کتاب منتقی الاخبار میں امام ابن تیمہ نے بھی درود کی وہی عبارت نقل کی ہے جس میں "آلہٖ" کا اضافہ حرفِ جار کے بغیر کیا گیا ہے۔ حالانکہ علمائے اہل حدیث کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کتاب مذکور ابن تیمہ نے نہیں بلکہ ان کے دادا عبدالسلام نے لکھی تھی اور اس کی شرح ایک زیدی شیعہ عالم علامہ شوکانی نے کی تھی۔ شیعہ حضرات چونکہ "آلِ نبی" کو نبوت کا حصہ سمجھتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ درود کی یہ غلط عبارت اسی راستے داخل ہو کر رواج پا گئی ہو لیکن حریری صاحب نے زندگی کے آخری سانس تک اس ضمن میں تحقیق کی ضرورت محسوس نہ کی اور اندھی تقلید پر ڈٹے رہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری کی کتاب "تاریخ تفسیر و مفسرین" کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ یوں تو یہ کتاب مصر کے ایک مشہور عالم علامہ محمد حسین ذہبی کی کتاب کا ترجمہ ہے، جسے پروفیسر صاحب نے اپنی تصنیف قرار دیا ہے۔ تاہم کتاب کے مندرجات پر اضافہ کرتے ہوئے پروفیسر صاحب ایک مقام پر رقمطراز ہیں کہ "ہمارے خیال میں ابن خلدون کا یہ قول درست نہیں کہ سب صحابہ قرآن کو سمجھتے تھے۔ قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام عرب اس کے مفردات و تراکیب کو بھی سمجھتے تھے۔"

اس کے ساتھ دعوے یہ بھی ہے کہ حدیث قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ احادیث ظاہر ہے، انہی صحابہ کرام سے مروی ہیں، جن میں سے کچھ بقول حریری صاحب، قرآن کے مفردات و تراکیب کا علم نہ رکھتے تھے۔ کاش حریری صاحب ان راویانِ حدیث کی نشاندہی بھی فرما جاتے جو ان کے خیال میں قرآن فہمی کے اہل نہ تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

نام کتاب :- QURANOCRACY NOT DEMOCRACY

تالیف :- ڈاکٹر سید عبدالودود

صفحات :- ۱۰۲، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ، خوبصورت پیپر بیک جلد

قیمت :- ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ :- (۱) خالد پبلشرز۔ ۵۰۔ عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۶۰۰

(۲) طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱

پرویز صاحب (مرحوم) کے قرآنی کوہکن کی نئی جوئے شیر

محترم پرویز صاحب، ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کو اسی القاب سے نوازتے تھے۔ پیشتر ازیں ڈاکٹر صاحب اکثر اپنے منفرد موضوع "قرآن اور کائنات" پر لکھتے رہے ہیں۔ موجودہ کتاب میں انہوں نے ایک سیاسی نوعیت کے موضوع QURANOCRACY کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی حکومت نہ مراعات یافتہ لوگوں کی حکومت ہوتی ہے۔ نہ بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کی حکومت، نہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت، نہ عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کی حکومت (جسے جمہوریت یا DEMOCRACY کہتے ہیں۔) بلکہ یہ قرآن کریم کے احکامات، قوانین اور مستقل اقدار کے اقتدارِ اعلیٰ کی حکومت ہوتی ہے جس میں عمالِ حکومت صرف قرآنی ہدایت کو عملی طور پر نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہم پاکستانی گزشتہ ۴۳ برس سے جس غلط راستہ پر بھٹکے پھر رہے ہیں۔ اس کا علاج ایک

اور صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مُلک کا نیا آئین قرآنِ کریم کی راہنمائی میں ترتیب دیا جائے۔ اس کے علاوہ موجودہ استحصالی معاشرے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور یہی پاکستان کی منزل ہے۔

کتاب کے باب اوّل میں بیان کیا گیا ہے کہ مغرب کا جمہوری نظام غلط اور تباہ کن ہے۔ اس کا ثبوت مغربی مفکّرین کی آراء سے اور پاکستان کے اپنے تجربہ سے مہیّا کیا گیا ہے۔

باب دوم میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے خود ساختہ قوانین کی بناء پر تعمیر کردہ نظامِ حکومت سے تنگ آکر ماڈرن انسان کا رجحان اب اس طرف ہے کہ نظامِ حکومت کی بنیاد ایسے قوانین پر ہونی چاہیئے جو غیر متبدّل ہوں اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان پر انحصار کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے قوانین قرآنِ کریم کے سوا کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کو اس باب میں تفصیلاً بیان کر دیا ہے۔

تیسرے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ آج دنیا میں تمام مصیبتوں کی جڑ نیشنلزم کا تصور ہے۔ انسان نے اس کا علاج اپنی سوچ کے مطابق انٹرنیشنلزم تجویز کیا تھا جو کہ لیگ آف نیشنز اور یو این او کے تجربات کے بعد ناکام ہو چکا ہے۔ قرآن نے اس کا علاج UNIVERSALISM عالمگیریت تجویز کیا ہے۔

چوتھے باب میں قرآنی آئینِ مملکت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور حقیقتاً یہی اس کتاب کے لکھنے کا اوّلین مقصد ہے۔

پانچویں باب میں بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی نظامِ مملکت میں احادیث اور قوانینِ فقہ کا کیا مقام ہے۔

چھٹے باب میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم نے FORM OF GOVERNMENT یعنی مملکت کے تنظیمی ڈھانچہ کی طرف اشارہ نہیں کیا اور جن امور پر قرآن کریم بحث نہیں کرتا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے امور کو مسلم اُمّہ اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قرآنی حدود کے اندر رہ کر طے کرے۔ چنانچہ طرزِ حکومت کی مختلف اقسام جو آج دنیا میں رائج ہیں، انکو واضح کر دیا گیا ہے۔ تاکہ قارئین انکے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے کر خود فیصلہ کر سکیں کہ فی زمانہ اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت کیا ہونا چاہیئے!

کتاب دلچسپ ہے اور پاکستان کی موجودہ مایوس کُن سیاسی حالت کو امید میں بدلنے اور خوشگوار نتائج پیدا کرنے کے لئے رہنما اصول مہیّا کرتی ہے۔

نوٹ :۔ طلوعِ اسلام ماہ ستمبر ۱۹۹۰ء کے پرچہ میں کتاب کی قیمت غلط درج ہو گئی تھی ادارہ معذرت خواہ ہے۔ قارئین اس کی تصحیح فرمالیں!!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثریّا عندلیب

حقوقِ انسانیّت کا واحد ضامن قرآنی نظامِ حیات ہے

جب ہم انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو ہمارا دانش ور اور تعلیم یافتہ طبقہ فوراً اقوامِ متحدہ کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے FUNDAMENTAL HUMAN RIGHTS (بنیادی حقوقِ انسانیت) کو متعین کر کے اِن کا چارٹر شائع کر دیا۔ جس کو قریب چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن دانشور طبقہ ہو یا عام پڑھے لکھے لوگ، بہت کم کسی کا دھیان اس ابدی حقیقت کی طرف جاتا ہے کہ انسانیت کی دنیا میں بنیادی حقوقِ انسانیّت کا تصوّر سب سے پہلے اللہ کی آخری کتابِ مبین قرآنِ حکیم نے دیا تھا جسے نازل ہوئے چودہ سو سال سے اوپر عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر ہُوا یہ کہ صدرِ اوّل کے عہدِ مبارکہ کے بعد (جس میں یہ حقوق عملاً اس قرآنی معاشرے کے انسانوں کو حاصل رہے۔) دینِ اسلام کی پٹڑی کو بدل دیا گیا تو انسانی حقوق کا تصوّر بھی یکسر بدل گیا۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حقوقِ انسانی کی جگہ انسانوں کے اپنے وضع کردہ حقوق نے لے لی اور اصل حقوق صرف تلاوت کرنے کے لئے رہ گئے۔ (حالانکہ اگر واقعی ان کی تلاوت (پیروی) کی ہوتی تو معاشرہ کا کوئی فرد اپنے حقوق سے محروم نہ رہتا) یہ وہ انسانی یا مسلمانوں کا المیہ ہے جو صدیوں سے مسلمانوں نے خود پر محیط کر رکھا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہماری ذلّت و پستی اور تباہی و بربادی کا بنیادی سبب یہی ہے۔ قرآنِ کریم نے نہائت وضاحت سے انسانی حقوق کو بیان کیا ہے۔ اگر اِن پر پورے غور و فکر اور سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو ان کے متعلق ہمارے درمیان کسی قسم کا شک و شُبہ سَر نہ اٹھائے۔

تو آئیے! ذرا دیکھیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ حقوقِ انسانیت کیا ہیں۔ اسی کتابِ عظیم میں سب سے پہلا درخشندہ حقِ انسانی تکریمِ آدمیّت کا نظر آتا ہے۔ یعنی ہر انسانی بچّہ مذکّر ہو یا مونث انسان ہونے کی جہت سے یکساں عزّت کا مستحق ہے۔ (۱۷ : ۷۰)

آپ کہیں گے اس حق کو کون نہیں جانتا۔ احترامِ آدمیّت کا چرچا ہوتا ہی رہتا ہے۔ جی ہاں!

وعظ و نصیحت کے لئے اس لفظ کا استعمال ضرور ہوتا ہے، لیکن حقیقت صرف اور صرف یہ ہے کہ بنیادی طور پر اسی حق کو ہم جان کر بھی نہیں جاننا چاہتے۔ اگر ہم نے اس حق کو واقعتہً جانا پہچانا ہوتا تو ہمارے ہاں عزت و ذلت کا معیار حسب نسب، رنگ، نسل اور مال و دولت نہ ہوتا اور ہم اپنے "سٹیٹس" سے کم تر افراد کو بنظرِ حقارت دیکھتے، نہ انہیں ذلیل کمی سمجھتے اور معاشرہ میں یہ جو اونچے نیچے طبقے روز مرہ حیات کا جزوِ اوّل بن چکے ہیں، انسانیت کو چاٹ جانے والی دیمک نہ بنتے۔ دوسرا بڑا حق جنسی مساوات کا ہے یعنی زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں (۱ : ۴) اس کی وضاحت قرآن کریم نے یوں کی ہے کہ جنسی تفریق، نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ مرد، مرد ہونے کی وجہ سے عورت سے کوئی افضلیت نہیں رکھتے، نہ ہی عورت، عورت ہونے کے سبب مرد سے کمتر ہے۔ زندگی کی ابتداء نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ہر انسانی بچہ میں، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا (۱۳ : ۴۹)۔ اس لئے مرد عورت الگ الگ نوع سے تعلق نہیں رکھتے، دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ حیاتیاتی طور پر مرد عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور اعمال کے نتائج بھی یکساں، (۱۹۴ : ۳) اس ہدایتِ قرآنی سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ جنسی مساوات انسانیت کا بنیادی حق جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بالمقابل اپنے معاشرے کو کھلی آنکھوں سے دیکھئے۔ جس طرح اس حق کو پامال کیا گیا اور کیا جاتا ہے، شاید ہی کسی دوسرے حق کے ساتھ ایسا سلوک ہوا ہو۔ ماضی کے ادوار سے لے کر حال کے زمانے تک مرد من حیث القوم عورتوں کی جس حد تک حق تلفی اور استحصال کرتے چلے آرہے ہیں، وہ دنیا سے پوشیدہ نہیں اور اس سے بڑھ کر حق تلفی بلکہ حق غصبی اور کیا ہوگی کہ احسن الخالقین کی بنائی ہوئی مکمل النسان عورت کو مرد نے بیک جنبشِ قلم و زبان "آدھا" کر دیا ہے اور اس پر "آدھی النسان" ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ کبھی ہم نے سوچا کہ اس حق کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری کس طرح پوری کی جاتی ہے۔

آگے چلئے! آزادی ہر النسان کا پیدائشی حق ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہر النسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے کسی النسان کو دوسرے النسان کا مطیع و فرمانبردار یا غلام بنا کر اس کو آزادی کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (۳ : ۷۸)۔ اب یہ دیکھئے کہ آزادی کا نعرہ تو ہر جگہ سے بلند ہوتا ہے لیکن

اس کا صحیح مفہوم سامنے نہیں لایا جاتا۔ برعکس اس کے کہ ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں۔ لیکن جن اربابِ اقتدار کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے وہ قانون کے پردے میں ہی ایسا ظلم و زیادتی کر جاتے ہیں کہ جس کے سامنے لاقانونیت کا استبداد بھی شرم سے نگاہیں جھکا لیتا ہے

قرآن کریم نے انسان کو جو آزادی کا حق دیا ہے اس کی قانون کی پابندی کے ساتھ مفاہمت کی ایسی صورت بتائی ہے جس سے قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہیں اور انسانی آزادی پر بھی آنچ نہیں آنے پاتی۔ اس کے لئے سورۃ آل عمران، آیت ۷۸ میں راہنمائی ملتی ہے، جس میں پہلے یہ واضح کیا گیا ہے کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوّت بھی کیوں نہ ملی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں"۔ یہ ہوئی کامل آزادی کی شکل اور قانونی پابندی کے لئے اسی آیت میں پہلے "مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ انسان کی آزادی پر پابندی لگانے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ مگر یہ پابندیاں مذہبی پیشوائیت کی صورت یعنی خدا کے نام آڑ میں نہیں ہونگی، جو استبداد کی بدترین شکل ہے۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳ : ۷۸)

"تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے، جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے اس کے مغز تک پہنچتے ہو، ربانی (یعنی اس کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ"۔

اگلی بات کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی ہے اور قرآن نے اسے کسی خاص گروہ یا جماعت کا حق نہیں بتایا بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امور ان کے باہمی مشورے سے طے پائیں گے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۳۸) یہ حقِ مشاورت بھی بنیادی حقوق میں شامل ہے، جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری اپنے اپنے حالات کے مطابق خود مرتب کی جا سکتی ہے خیال رہے کہ اس حقِ مشاورت میں مرد کے ساتھ عورت بھی شامل ہے۔ قرآن نے وہ قوانین دیئے ہیں جن کی پابندی کرائی جائے اور وہ حدود متعین کی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ باہمی مشاورت

سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتّب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے یا ان کے علاوہ اور حدود و قیود متعیّن کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کرنا ہوگا۔ جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جا سکتی۔ سورۃ شوریٰ میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔ "کیا اِن کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی (۴۲ : ۲۱)۔ چنانچہ انسانی آزادی کو قرآن کے عطا کردہ قوانین و حدود کا پابند رہنا ہوگا اِس سے آزادی بھی قائم رہتی ہے اور معاشرہ لاقانونیّت سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

اب آئیے! حقِ محنت کی طرف کہ محنت کئے بغیر زندگی کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ قرآن کا اِس بارے میں ارشاد ہے:۔

وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (۵۳ : ۳۹)

ہر شخص کو اس کے کام کا پُورا پُورا معاوضہ ملے گا۔

کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا نہ اس میں کمی۔ محنت کا پُورا پورا حق ادا کرنیکا نام عدل ہے۔ قرآن کی رُو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفّظ شامل ہے۔ عدل کی اہمیّت اس قدر ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے جہاں اپنا حق لینا ضروری ہے وہاں دوست دشمن کے حق کی ادائیگی بھی اوّلین فریضہ ہے۔ عدل کے ساتھ احسان بھی بنیادی انسانی حق ہے یعنی جس فرد میں اس کی کسی لغزش یا کوتاہی کے بغیر کوئی کمی واقع ہوگئی ہو اس کی کمی کو پورا کر کے معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچا لیا جائے (۱۶ : ۹۰) اسی کا نام احسان ہے۔ احسان وہ خیرات نہیں جو ہمارے ہاں مروّج ہے جو شرفِ انسانیت کو پامال کرتی اور خیرات لینے والے کی عزّتِ نفس کو سلب کرتی ہے۔ احسان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ دوسرے کی کمی کو پُورا کرنا ہے۔ بلکہ جس کی کمی رہ جائے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے (۷۰ : ۲۴) دوسرے لفظوں میں یہ کہ زیادہ کمانے والوں کی دولت میں ان لوگوں کا حق ہے جو کسی وجہ سے محنت سے معذور ہو گئے ہوں۔ اس طرح حق رزق ہر انسان کو حاصل ہو جاتا ہے (۶ : ۱۵۲) ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کا مدار سامانِ زیست پر ہے اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی ذمّہ داری ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی نوید یہ ہے کہ "دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمّہ داری اللہ پر نہ ہو" (۱۱ : ۶) اللہ کی ذمّہ داری سے مراد کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

قرآن کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر ذی حیات فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا انتظام کرے، اس سے کوئی شخص محروم نہ رہنے پائے، وہ اس ذمہ داری کو نبھانے کا اعلان کرے

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶:۱۵۲)

"ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔"

بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورے کئے جانا ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ وہ حق ہے جو دنیا والوں کے بنائے ہوئے کسی چارٹر میں نہیں مل سکتا۔

جہاں تک اولاد کے لئے رزق مہیا کرنے کی ذمہ داری ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ قرآن کریم کا فرمان ہے:۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ

اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کر دو۔

تو اس میں قتل سے مراد جان سے مار ڈالنا ہی نہیں اس سے مُراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ اور صحیح تعلیم و تربیت ہو۔ تحصیلِ علم کا حق ہر انسانی بچہ رکھتا ہے۔ اس بناء پر افرادِ معاشرہ کو اس حق سے محروم رکھنا اور شروع سے ہی بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کرنا پوری انسانیت کو نشوونما سے محروم رکھنا ہے۔

اِقْرَاْ کی پہلی وحی معاشرہ کے تمام مردوں، عورتوں کو تحصیلِ علم کا حکم دیتی ہے۔ ان کا فریضۂ زندگی بتاتی ہے۔ یہ فرض ان کا حق بن جاتا ہے کہ اس کے بغیر انسان سطحِ انسانیت پر آ ہی نہیں سکتا۔ اب یہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ ہمارے معاشرے کا سنگین ترین المیہ جہالت ہے تو کیوں ہے؟ ہماری ساٹھ ستر فیصدی آبادی کو اس اوّلین حق سے محروم کیوں رکھا گیا ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ معاشرے میں انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت ملنا بھی ضروری ہے۔ خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کوئی اس کا مجاز نہیں کہ وہ کسی کو جان سے مار دے (بجز ایسی صورت کے جس کی تصریح قرآن نے کر دی ہے (۵ : ۳۲)) قرآن کے نزدیک کسی انسانی جان کو ناحق تلف کرنا پوری نوعِ انسان کو تلف کرنے کے برابر ہے اسی طرح کسی ایک انسان کی جان کو بچانا، پوری نوعِ انسان

کی جان بچانا ہے۔ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے قانون کی رُو سے سزائے موت مقرر کی ہے وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو باالحق کہا گیا ہے۔ اس کے بعد قانونِ خداوندی کی رُو سے اِن چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق کا حصّہ ہے جو قانوناً کسی کے ذاتی تصرّف میں رہیں۔ کوئی دوسرا ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرّف میں نہیں لا سکتا "تم آپس میں ایک کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ (۲۹ : ۴۵) جان اور مال کی حفاظت کے ساتھ سکونت کا حق ناگزیر ہے۔ ۸۵ : ۲ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہودیوں کے اِس فردِ جُرم کے حوالے سے کہ وہ لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے اور گھروں سے نکال دیتے تھے۔ عصمت وہ بلندترین قدر ہے جس کی حفاظت کو قرآن نے مستقل حق انسانیت قرار دیا ہے اور اس حق کی پامالی کو ایسا سنگین جُرم قرار دیا ہے جس کی سزا بھی سنگین ہے۔ (۲ : ۲۴) شادی میں انتخاب کا حق۔ سورۃ النساء کی تیسری اور انیسویں آیت میں بتایا گیا ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی رضامندی سے رشتہ منتخب کرنا دونوں کا ایسا حق ہے جس کے بغیر شادی ہو نہیں سکتی۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کتنی عورتوں کو صحیح معنوں میں یہ حق حاصل ہے؟ قرآن کریم نے کسی بنیادی حق سے انسان کو محروم نہیں رکھا۔ انفرادی حسنِ ذوق بھی انسان کا حق ہے۔ جس کے تحفظ کی ضمانت قرآن نے اس اعلان کے ساتھ دی ہے کہ "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دے سکتا ہے" (۳۲ : ۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے خوشگوار سامانِ زیست اور زیب و زینت سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا ہر فرد کا بنیادی حق ہے جو معاشرہ میں رہتے ہوئے اُسے ملنا چاہیئے

انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے ایمان کا راستہ اختیار کرے یا کُفر کی راہ پر چلے۔ چنانچہ مذہب ہو یا دین، انسان کو اس کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ کسی مذہب کا پابند ہو یا دین کی راہ پر گامزن ہو۔ جو بھی راستہ اختیار کرے گا یہ اس کا حق ہوگا۔ دین کے معاملہ میں کسی پر جبر نہیں ہو سکتا (۲۵۶ : ۲) سچائی کی مستقل قدر کو قرآنی معاشرے سے جو نسبت ہے اسے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم نے افراد کو سچ بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے کہ وہ جہاں بھی ضرورت ہو حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں اور عدل و انصاف کو قائم رکھنے کے لئے یہ ایک بنیادی ضرورت ہے کہ سچی بات کہنے میں کسی رُو رعائت اور تذبذب کو حائل نہ ہونے دیا جائے۔ سورۃ النّساء کی ۱۳۵ ویں آیت میں پوری وضاحت کے

ساتھ اس کے احکام آئے ہیں۔ سچی بات صاف صاف دو ٹوک کرنی چاہیئے۔ یہ اتنا اہم حق ہے کہ معاشرہ کو یہ تاکید کی گئی ہے۔ کہ حق بات کی شہادت دینے والے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ (۲ : ۲۸۲)۔

مظلوم کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے وہ اس کے مداوا کے لئے فریاد کرے (۴ : ۱۴۸) ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی قرآن میں دیا گیا ہے (۲۴ : ۲۷) اسی طرح ہر فردِ معاشرہ کو حیثیتِ عُرفی کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بُری بات کو خواہ مخواہ اچھالا جائے (۴ : ۱۴۸)۔ اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے اصلاح کی جائے۔ کسی کے اُلٹے سُلٹے نام نہ رکھے جائیں (۴۹ : ۱۱) محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ (۴۹ : ۱۲)۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہ سمجھا جائے (۲۴ : ۱۲۶) بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی جس سے قرآن نے سختی سے روکا ہے (۴۹ : ۱۲)۔ اس قسم کے تاکیدی احکامات سے قرآن افراد کی حیثیتِ عرفی کی حفاظت کرتا ہے۔

قرآن حکیم کے عطا کردہ ان حقوقِ انسانیت کے مصفّا آئینے میں اگر موجودہ معاشروں کی اصلی صورت دیکھی جائے تو نظر آئے کہ اس دنیا کے چند انسانوں نے دوسرے تمام انسانوں کے یہ بنیادی حقوق چھین لینے یا غصب کرنے کے لئے کیا کیا انداز اور کیسے کیسے طریق اختیار کر رکھے ہیں۔ انسانیت کی نشوونما ہو تو کیسے؟ خود ہمارے ہاں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ اور وہ اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں! حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں جو اضطراب و انتشار ہمہ وقت پایا جاتا ہے، اس کی وجہ آبادی کی اکثریت کا اپنے ان حقوق سے محروم کر دیا جانا ہے جو ربّ العالمین نے عطا کئے ہیں جس نے اپنے بندوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھنا حرام قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان حقوق کے روز مرّہ کی زندگی میں استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے کیا چیز ضروری ہے حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہُوا جائے اور لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصوّر مشترک ہو۔ فلسفۂ زندگی یا آئیڈیالوجی ایک ہو۔ قرآن کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نے تمام نوعِ انسان کے لئے اقدار کے یکساں پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "اے نوعِ انسان! تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آگیا ہے۔ اس میں ہر اُس

نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے جو انسان کے دِل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے اور اس طرح معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا مُوجب بنتی ہے۔ جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں (اور اس پر عمل کرتے ہیں) یہ ان پر کامیابیوں اور خوش گواریوں کی راہ کشادہ کر دیتا ہے۔" (۷۵ : ۱۰) اس ایمان کی بنیاد علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے متعین ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اقوام کی موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قومیں حقوقِ انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا عسکری ساز و سامان اور سیاسی مہرہ بازیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ ہمیں جان لینا چاہیئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر بدلا ہے نہ کبھی بدلے گا۔ یہی وہ ایمان یا فلسفۂ زندگی ہے جس سے حقوقِ انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ اسلامی مملکت کا یہی بنیادی فریضہ ہے بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جواز ہی یہی ہے۔

یاد رکھیئے!! یہ مقصدِ عظیم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اِس خطۂ زمین میں قرآنی نظامِ زندگی قائم نہ ہو کہ صرف وہی نظام احترامِ آدمیّت کا ضامن اور حقوقِ انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے:۔ ؎

اگر با اِیں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اِتحاد

اسلام کی دعوت کا منتہیٰ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ یہ برادری آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کے اِشتراک سے قائم ہوگی جسے ایمان کہتے ہیں۔ اس عظیم پروگرام کی ابتداء ایک امّت کی تشکیل سے ہوتی ہے جسے امّتِ مسلمہ (مسلمان) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس امّت میں باہمی اختلاف اسلام کی بنیادی تعلیم اور اساسی مقصد کے خلاف ہے، اِس لئے قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک اور پارٹی بازی کو جُرمِ عظیم قرار دیا ہے۔ ساری دُنیا میں پھیلی ہوئی امّت میں وحدت قائم رکھنے کیلئے ایک محسوس مرکز کی ضرورت ہے۔ یہ مرکز کعبہ ہے یعنی اسلامی نظام کا مرکزی مقام۔ جب اس اُمّت کا دائرہ وسیع ہوتا جائیگا تو یہی مرکز نوعِ انسانی کی وحدت کا مرکز بن جائیگا۔ امّتِ مسلمہ کے نظام کی بنیاد وحدتِ قانون (قرآن) اور وحدتِ مرکز (کعبہ) پر رکھی گئی ہے۔ اختلاف اور تفرقہ سے یہ اُمّت امّتِ مسلمہ رہتی ہی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رابطۂ باہمی

۱ کویت میں احباب خیریت سے ہیں۔ محترم بشیر احمد عابد صاحب کراچی پہنچ چکے ہیں۔ دوسرے احباب بھی امید ہے جلد واپس آجائیں گے۔ ناروے کینیڈا، لندن اور یارک شائر میں احباب خیریت سے ہیں، ڈنمارک، فرینکفرٹ سٹڈ اور سعودی عرب سے اس ماہ کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

۲ کنونشن ۱۹۹۱ء کے لئے تجاویز کا شدت سے انتظار ہے۔

۳ رسالہ کے متعلق احباب کی آراء اور قلمی معاونت کے لئے ادارہ چشم براہ ہے۔

۴ بزم طلوعِ اسلام فیصل آباد نے احتساب کا عمل اپنی بزم کے اراکین سے شروع کیا ہے جس میں ہر رکن کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ جواب دے کہ قرآن فہمی، بلندیٔ اخلاق اور قرآنی فکر کی تبلیغ میں اس کی اپنی کارکردگی کیا رہی ہے اور یہ کہ کیا اس کی رائے میں بزم اپنی افادیت کھو چکی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی اصلاح کی عملی صورت، اس کے خیال میں کیا ہو سکتی ہے؟

ادارہ:۔ بزم کو ہمہ وقت فعال رکھنے کے لئے احتساب کے عمل کا جاری رکھنا بے حد ضروری ہے امید ہے باقی بزمیں بھی اس پر عمل پیرا ہونگی اس قسم کی کاروائی کے نتائج سے مرکزی دفتر کو خبردار رکھنا اور بھی مفید ہو سکتا ہے۔ بزموں سے التماس ہے کہ اپنے اپنے ہاں وہ یہ پابندی عائد کریں کہ ہر رکن نہ صرف خود رسالہ خرید کر پڑھے بلکہ ہر سال ایک نئے خریدار کا اضافہ بھی کرے اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے۔ اراکین پر یہ پابندی بھی عائد کی جائے کہ وہ رسالہ اپنے گھر کے پتہ پر بذریعہ ڈاک منگوائیں اور امورِ بزم اور ادارہ میں اپنا تعارف اپنے خریداری نمبر سے کرائیں۔ اراکینِ بزم کے لئے کمپیوٹر میں الگ فائل کھول دی گئی ہے۔ جس کی تفصیل ہر کنونشن کے موقع پر احباب کے سامنے پیش کی جائے گی۔ جو اراکینِ بزم پہلے سے رسالہ بذریعہ ڈاک منگوا رہے ہیں ان سے التماس ہے کہ وہ ادارہ کو خط لکھ کر بزم کے رکن کی حیثیت سے اپنا اپنا نمبر حاصل کر لیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المراسلات

موہڑہ سیداں مری
۴ ستمبر ۱۹۹۰ء

مکرمی ایڈیٹر صاحب!

طلوعِ اسلام کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۰ء کے بارے میں اپنے تأثرات پیش کرتا ہوں!

۱۔ 'لمعات'، "قتلِ عمد ــــ قابلِ راضی نامہ؟"

آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ آئندہ اشاعت میں بذریعہ انگریزی زبان اس کا پھر اعادہ کیجئے گا۔ تکرار انسان کو متأثر کرتا ہے

۲۔ محترمہ زاہدہ درّانی صاحبہ نے "دولت کی پیدا کردہ بیماریاں" کے عنوان سے اچھا لکھا ہے اے کاش وہ "الْاَرْضُ لِلّٰہِ" کو پیداوار و ارتکازِ دولت کے اہم وسیلہ کی حیثیت سے بھی قابلِ توجہ سمجھتیں ــــ دولت کی بڑی بیماری کالا دھن تھا جس کو ہر حکومت نے تکبیر پڑھ کر حلال بنانے کی کوشش کی۔ علماء و مشائخ سے کوئی بھی اس کے خلاف نہ بولا

۳۔ "علماء کی طرف سے لاؤڈ سپیکر پر پابندی"

آپ نے اچھی ابتداء کی ہے۔ اس تحریک کے حق میں لکھے جانے والے مضامین کا انتخاب آئندہ بھی شاملِ اشاعت کیا جانا چاہیئے

۴۔ "اپنی بہنوں کے نام" محترمہ لفیرہ صاحبہ نے اچھا لکھا ہے۔ ص۴۳ کے آخری پیرا میں "نابالغ لڑکی کی شادی" درج کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی تصحیح شائع کردیں۔

۵۔ قاسم نوری صاحب کا مضمون "یوں بدل دیتے ہیں قرآن کا مفہوم"

محترم قاسم نوری صاحب نے اپنی بیٹی کے سوال "خدا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟" کو لفظ خدا اور اللہ کی بحث میں الجھا کر ٹال دیا ہے بیٹی اگر یہ پوچھ لیتی کہ "اللہ کون ہے کہاں رہتا ہے؟"

تو باپ کی کون سی مشکل حل ہو جاتی ؟

اب باپ کا جواب ملاحظہ فرمائیں:۔

" بیٹا خدا وہ ہے جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ جس نے حیوان بنائے، انسان بنائے۔ مجھے ابّو کو اور تمہیں پیدا کیا "

یہی مشکل جو ہم پیدا کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم انسان کو بھی دیگر مخلوق (حیوان، پودے، پہاڑ۔ چاند سورج، ستارے) کے برابر درجہ دیدیتے ہیں، جس سے انسان کا کوئی امتیازی مرتبہ اجاگر نہیں ہو پاتا حالانکہ انسان کا مقام تو ایسا ہے کہ:۔

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

قرآن کہتا ہے:۔

وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ (۳۲/۹)

یعنی انسان کو روح، نفس، انا، خودی، مَیں، I (PERSONALITY) کی قوت دی گئی جو چاند۔ سورج۔ ستاروں۔ حیوانوں۔ پودوں۔ پہاڑوں میں نہیں ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہم ان چیزوں پر تو زور دیتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، لیکن انسان کی امتیازی خصوصیت "نفخِ رُوح" کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مَیں اگر قاسم نوری کی جگہ ہوتا تو اپنی بیٹی کو بتاتا کہ:۔

" اللہ وہ ہے جس نے تمہاری "مَیں" تم کو عطا کی "

اور تمہاری "مَیں" کی راہنمائی کے لئے مکمل راہنمائی، قرآن دیا۔ انسان کو "مَیں" I۔ انا۔ خودی دیکر آزاد پیدا کیا اور اللہ وہ ہے جس نے کتابِ فطرت (قرآن) دے کر اسے وہ درجہ عطا کر دیا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے تو گویا وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اس کو قرآن کے مطابق پابندِ فطرت پیدا کیا گیا ہوتا۔

نماز میں رکوع و سجود صرف بدن کا فعل ہے۔ سوچ کہیں اور ہوتی ہے، جسم رکوع و سجود میں فقط تقلید کے رُوپ دھار رہا ہوتا ہے۔ قرآن، انسان کی خودی۔ رُوح۔ انا۔ I۔ مَیں کو تربیّت و تزکیہ سے اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں جسم کے ساتھ اس کی رُوح بھی رکوع و سجود کرے۔

مَیں اس سے متفق ہوں کہ خدا کی جگہ اللہ کو لایا جائے لیکن صرف اور صرف اس انسان کے لئے جو جو خودی کا شعور رکھتا ہو۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:۔

شاخِ نہالِ سدرہ خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

قرآن اسی کو فائدہ دے سکتا ہے جو سینہ تان کر "میں" کہے اور پھر اپنی زندگی کی "میں" قرآن کے سامنے جھکا دے تاآنکہ پوری زندگی مسلم ہو جائے:-

اگر با او نرسیدی تمام بولہبی است

GOD اور اللہ کا فرق جس انداز سے قاسم نوری صاحب نے واضح کیا ہے وہ اس پر مبارکباد کے مستحق ہیں اس تصویر (یعنی مفہوم بدل دینا) کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کچھ الفاظ بس یونہی دہرا لیئے جاتے ہیں ان کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر شیطان کی جگہ جذبات کا لفظ لایا جائے تو حسد، نفرت اور انتقام کے سفلی جذبات کو شیطان کے روپ میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح "شجرۃ" سے مراد لی جاتی ہے "گندم" کا درخت حالانکہ گندم گھاس ہے درخت نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے شجرۃ کی کیا بہترین تشریح کی ہے:-

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ۔ (۱۷:۶۰)

یہاں اس درخت کو بھو سر کا درخت بتا کر فرقہ بندیوں پر مکاتبِ فکر کی رنگین مہر لگا کر خود فریبی اور خدا فریبی کی کامیاب کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ فرقہ بندی از خود لعنت ہے۔

والسلام
ملک حنیف وجدانی

ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۹۰ء

جناب ناظم ادارہ صاحب! السلام علیکم!

میں نے صرف بیس پچیس روز قبل ہی طلوعِ اسلام پڑھنا شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے میں اسلام سے کافی بیزار تھا یا یوں سمجھ لیجئے کہ اگرچہ میرا ایمان اور اعتقاد تو تھا اور میں نماز روزے کی ظاہری پابندی کرنے کی بھی پوری کوشش کرتا تھا۔ مگر دلی طور پر میں سوچا کرتا تھا کہ کیا موجودہ دور کے لاتعداد مسائل کا حل اسلام کے پاس ہے؟۔ بچپن میں تو میں سمجھتا تھا کہ سب مسلمان ایک ہوتے ہیں۔ مگر جوں جوں بڑا ہوا تو مسلمانوں کی مختلف قسمیں سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ کوئی حنفی تو کوئی اہلحدیث تھا اور جب مجھے بتایا گیا کہ تم سید ہو اور سنی ہو تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے محدود کر دیا گیا ہے۔ ایک روز ایک شیعہ لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ شیعہ ہیں؟ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو بڑی حیران ہوئی اور بولی سید تو شیعہ ہوتے ہیں۔ اس

مجھے پتہ چلا کہ سنّی بھی دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اب اور آگے بڑھئے تو انکشاف ہوتا ہے کہ تم حنفی تو ہو مگر دیوبندی نہیں بلکہ بریلوی ہو۔ یہ سُن کر تو جیسے میرا سر چکرانے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ہم واقعی مسلمان ہیں۔ کیونکہ دوسرے فرقوں کے لوگ ہمیں کافر کہہ رہے ہیں۔ اس کشمکش میں میں نے حق کی تلاش شروع کر دی مگر بات صرف فرقوں تک ہی محدود رہی۔ میں نے سارے فرقے بدل کر دیکھے کہیں بھی سکون نہ ملا۔ پھر خدا نے مدد کی اور مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ میرے ہاتھ پرویز صاحب کی دو پرانی کتابیں لگ گئیں جن میں سے ایک، "سلیم کے نام خطوط" تھی۔ اس کے علاوہ ۲۰۔ کے قریب طلوعِ اسلام کے پرانے شمارے بھی ملے۔ (یہ اب نانا کی انتہائی پرانی کتابوں سے ملے) میں نے ان سب کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالا ہے جُوں جُوں پڑھتا جاتا تھا اندھیرا چھٹتا جاتا تھا اور دِل و دماغ روشن ہوتے جاتے تھے۔ اسلام کی عظمت واضح طور پر میرے سامنے آگئی اور میں انتہائی سچّے دِل سے خدا پر ایمان لے آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اب مسلمان ہوا ہوں خدا پرویز صاحب کو جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے!

فقط طلوعِ اسلام کا ایک نیا قاری
سیّد عباس حسن!

گر بجرم غیرِ قرآں

"آسمان کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے جس پر عقلِ سلیم حرف گیری نہیں کر سکتی اور اس کا مصنّف تنقید سے بالاتر ہے۔ لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون"

"اسے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ باقی سب زیرِ سوال ہیں"

"ہم مسلمان آپس میں بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے بھی قرآنِ مجید اور خدائے پاک کی اس خصوصیت میں بالکل متفق ہیں"

یہ تھے وہ الفاظ جو خواجہ غلام محمد محقق مرحوم امرتسری نے ایک صحبت میں کہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیاسی پارٹیاں

طلوعِ اسلام ایک عرصہ سے لکھتا چلا آرہا ہے کہ قرآن کی رُو سے:۔

١ دین میں تفرقہ پیدا کرنا مشرکین کا شیوہ ہے۔

٢ تفرقہ کے معنی فرقہ بندی کے ہیں۔

٣ اسلام میں مذہب اور سیاست میں چونکہ ثنویت نہیں لہٰذا دین میں تفرقہ کے اندر مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں دونوں آجاتی ہیں۔

اس کا ایمان ہے کہ:۔

١ خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے۔ اسی پر حضورؐ گامزن تھے اور اسی پر چلنے کی تاکید مسلمانوں (امّت) سے کی گئی تھی۔

٢ فرقہ بندی میں ہر فرقہ الگ الگ راستہ اختیار کرلیتا ہے اور اسی طرح خدا کی طرف جانیوالا راستہ نگاہوں سے گم ہو جاتا ہے۔

٣ فرقہ بندی اور باہمی اختلاف خدا کے عذاب کا موجب ہیں

آئین کے آرٹیکل D-203 ڈی کے تحت راولپنڈی سے جناب راجہ عبدالرزاق عادل صاحب نے وفاقی شرعی عدالت سے استدعا کی ہے کہ قرآن وسنّت میں موجود واضح ہدایات کی روشنی میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ ۱۹۶۲ء کے سیکشن ۳ کو جس کے تحت ایک سے زاید سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دی گئی ہے، خلافِ قرآن و سنت قرار دیا جائے۔ ان کی درخواست جس کی پیروی جناب غلام مصطفےٰ اعوان صاحب اور جناب عبداللہ ثانی صاحب کر رہے ہیں! ۲۰ مئی ۱۹۸۹ء سے وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد میں زیرِ سماعت ہے۔ اپنی درخواست کے تسلسل میں جناب عادل صاحب نے فاضل عدالت کے سامنے بنیادی قسم کے ایسے سوالات بھی رکھے ہیں، جو قرآنی احکام کی تعبیر و تشریح میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت کے نام جناب عادل صاحب کی یکم جنوری ۱۹۹۰ء کی درخواست میں درج یہ سوالات جنہیں ہم اس اشاعت میں شامل کر رہے ہیں ہر پاکستانی مسلمان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ قارئین اپنی آراء کے اظہار کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے براہِ راست یا ادارہ ہٰذا کی

معرفت جناب عادل صاحب سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں:۔ استفسارات حسب ذیل ہیں!

۱ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے اور یہ کہ اسلام کو مذہب کے نام سے موسوم کرنا صحیح ہے؟

۲ اجتماعاتِ صلوٰۃ کی موجودہ صورت نماز، کیا قیامِ صلوٰۃ کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور یہ کہ موجودہ صورتِ نماز کو تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۴۵ : ۲۹) میں کس قدر عمل دخل ہے؟

۳ زکوٰۃ اور صدقہ میں کیا فرق ہے اور یہ کہ زکوٰۃ کو صدقات سے متعلق مصارف تک محدود کرنے سے اسلام کے معاشی نظام کو جو حیاتِ کلیہ (۶ : ۱۱) کو احاطہ کرتا ہے اس عظیم مقام اور کردار سے محروم نہیں کر دیا گیا جو اسلامی نظامِ معیشت کی اصل و بنیاد ہے؟

۴ امّت اور جماعت میں کیا فرق ہے اور یہ کہ کیا جماعت کا لفظ امّت کے لئے استعمال کرنے سے معنی و مفہوم میں فرق اور اعجازِ قرآن کی نفی کرنا نہیں ہے؟

۵ فرقہ اور مکتبِ فکر میں کیا فرق ہے، کیا فرقہ بندی اسلام میں شرک (۳۲-۳۱ : ۳۰ - ۱۶۰ : ۶) نہیں ہے اور یہ کہ آج ملّتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والے مختلف گروہ جو اپنے آپ کو مکاتبِ فکر کے لفظ سے موسوم کرتے ہیں۔ کیا اصل میں مذہبی فرقے نہیں ہیں؟

۶ کیا اسلامی ریاست میں سیاست، مملکت کو چلانے کا علم و عمل، دین کا جزوِ لاینفک نہیں ہے اور یہ کہ کیا موجودہ سیاسی گروہوں یعنی پارٹیوں کی بنیاد آپس میں بنیادی سیاسی اختلافِ رائے پر نہیں ہے اور کیا یہ عمل و کردار دین میں اختلافِ رائے کر کے گروہ (شِيَعًا)[1] بننا نہیں ہے؟

۷ سنّت اور اسوہ میں کیا فرق ہے اور یہ کہ کیا قرآنِ کریم میں سنّت کا لفظ، اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس واعلیٰ کے سوائے اور کسی ذات کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ نیز کیا سنّت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے[2] لئے استعمال کرنا اعجازِ قرآن کے خلاف بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ برابری پیدا کرنا نہیں ہے؟

۸ کیا اسوہ صرف انبیاء کے اقوال و افعال، مجموعۂ احادیث تک محدود ہے یا اس میں کوئی اور ہستی یا ذات بھی شامل ہے۔ مثلاً اصحابہؓ جن کو قرآنِ کریم میں انبیاء کا ساتھی کہا گیا ہے کیا وہ بھی اس میں شامل ہیں؟

۹ کیا مجموعۂ احادیث پر مبنی علمِ کلام، قرآنِ کریم (وحیٔ خداوندی) سے ہٹ کر بھی صحیح ہو سکتا ہے اور یہ کہ اس علمِ کلام کو قیام الدین میں کیا پوزیشن و کردار حاصل ہے؟

۱۰ الدّین اور شریعت نیز کلام اللہ، سنّت اللہ اور شریعت میں کیا تعلق اور فرق ہے اور یہ کہ

÷ (۱ ۲) فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

الدّین تو تمام انبیاءؑ کا ہمیشہ ایک رہا ہے۔کیا شریعت بھی ایک تھی۔حالانکہ ایک ہی دور میں قرآنِ کریم کے مطابق مختلف اقوام کی طرف الگ الگ انبیاء مبعوث ہوئے ہیں؟

۱۱ جمہوریت اور شورائیت میں کیا فرق ہے اور یہ کہ افرادِ اُمت سے مشورہ کے بعد انبیاءؑ متعلقہ مشورہ کے کس حد تک پابند تھے نیز اس کے بعد اسلامی ریاست کے امر کا کیا کردار و پوزیشن رہی ہے؟

۱۲ ارکانِ الدّین:- ا۔ کلمۂ طیبہ ب۔ نماز (اجتماعات الصّلوٰۃ) ج۔ روزہ د۔ زکوٰۃ ہ۔ حج کا اسلامی نظام کے قیام اور استحکام میں کیا کردار ہے اور یہ کہ موجودہ صورت اس عظیم کردار کو کس حد تک پورا کرتی ہے۔

۱۳ مُسلم، مومن، کافر اور منافق کی قرآنِ کریم کے مطابق کیا درجہ بندی ہے؟ اور یہ کہ موجودہ ملت اسلامیہ کے افرادِ معاشرہ کی اکثریت (الا ماشاء اللہ) کس زُمرہ میں آتی ہے؟

۱۴ عالمِ امر اور عالمِ خلق میں کیا فرق ہے اور یہ کہ عالمِ خلق سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اعلیٰ و ارفع سے منسوب قرآنِ کریم کی ذمّہ داریاں و کردار کس طرح عملی صورت اختیار کرتی ہیں۔اس سلسلہ میں سنّت اللہ کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت اور وحیٔ خداوندی کے مطابق قائم نظامِ تمدّن (حکومتِ الٰہیہ) کی کیا پوزیشن و کردار ہے؟

۱۵ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۱۷ : ۷۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۱۹ : ۷۵) ارشاداتِ الٰہی سے کیا مراد ہے نیز یہ کہ ان ہر دو آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ مقدس کردار سے متعلق تعبیر و تشریح کیا ہے؟

۱۶ کیا تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان، دو نسلی، لسانی، علاقائی یا سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگرس کی بنیاد پر چلائی گئی مہم و جدّوجہد کا نتیجہ ہیں یا دو نظریات اسلام اور مخالفِ اسلام (ہندو ازم) یعنی ملّتِ اسلامیہ اور ملّتِ غیر اسلامیہ کے مرہونِ منّت ہے اور یہ کہ افرادِ ملّتِ اسلامیہ نے خاص طور پر ان علاقوں کے مُسلم افراد نے جن کے علاقے کسی طرح سے بھی مملکتِ خداداد پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتے تھے تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصّہ اور قیامِ پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ کُن ووٹ کس بُنیاد اور اُمید پر دیا تھا؟

:۔ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ

لہ القرآن (۳۲-۳۱ : ۳۰ | ۱۶ : ۶)

۲ بمعنی مستقل قوانین، جب کہ مستقل قوانین وضع کرنے کی صرف "اللہ" کی ذات ہی سزاوار ہے۔

۱۷ اسلامی نظام میں غیر مسلم کی کیا پوزیشن ہے اور یہ کہ غیر مسلم افراد کو اسلامی مملکت میں کس حد تک انتظامی ذمہ داریاں سونپی جاسکتی ہیں، نیز اسلامی مملکت، خاص طور پر مملکتِ خداداد پاکستان کی کی غیر مسلم مملکتوں میں آباد مسلمان افرادِ معاشرہ سے متعلق کیا ذمہ داریاں ہیں۔؟

۱۸ کیا مملکتِ خداداد پاکستان کے قیام کے بعد چالیس سال سے پاکستان کا نظامِ حکومت (ا)، ارشادِ الٰہی! فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (۴۸ : ۵) ۔ (اے رسولؐ) تم ان کے فیصلے (حکومت کا قیام) بما انزل اللّٰہ (قرآن کریم) کے مطابق کرو ۔ (ب) وحیٔ خداوندی کی زبان میں اقرارِ رسولؐ (اسوۂ حسنہ) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ (۶:۵۰ ۳۰۲ : ۷ ، ۱۵ : ۱۰ ، ۹ : ۴۶) ۔ (اے رسولؐ کہہ دو) میں تو "ہر صورت میں" وحیٔ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں ۔(ج) ۔ فرمانِ علامہ اقبالؒ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(د) اعلانِ قائدِاعظمؒ! 'اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے'، کے مطابق چل رہا ہے ۔ اگر نہیں جو امرِ واقعہ ہے تو پھر یہ کس طرح سے ممکن ہے اور اس فرضِ منصبی کی ادائیگی کس کس کی ذمہ داری ہے۔؟؟؟

۱۹ قرآن کریم کے مخاطب علماء اور مذہبی پیشوائیت میں کیا تقابل ہے اور یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں ان ہر دو طبقات کا وجود اور کردار کس قدر قابلِ صد ستائش اور غور طلب ہے؟

۲۰ اسلامی مملکت اور حکومت کے اندر فتنہ و فساد پیدا ہونے یعنی عام لاء اینڈ آرڈر کے نام کام ہو جانے پر غیر معمولی اقدامات اور قوانین کے نفاذ سے متعلق قرآن کریم میں کیا راہنمائی موجود ہے اور یہ کہ اسلامی ریاست میں مارشل لاء کی ہیئت وصورت کیا ہو سکتی ہے ؟

۲۱ مندرجہ بالا سوالات کی روشنی میں :۔ (ا)۔ کیا اسلام یں "الدین" سے متعلق اختلافِ رائے کی بنیاد پر گروہ بندی جائز ہے ؟ (ب) ۔ کیا اسلامی نظامِ حکومت میں، مملکت وحکومت کو چلانے کا علم وعمل یعنی سیاست "الدین" کا جزوِ لاینفک ہے ؟ (ج)۔ کیا مملکتِ خداداد پاکستان جو جو آئینی طور پر اسلامی مملکت ہے، میں سیاسی گروہ (پارٹیاں) سیاسی اختلافاتِ رائے کی بنیاد پر قائم نہیں ہیں؟ (د)۔ اگر یہ گروہ بندیاں سیاسی بلکہ مذہبی بھی اختلافِ رائے کی بنیاد پر قائم ہیں جو کہ امرِ واقعہ ہے تو پھر کیا یہ گروہ بندیاں یعنی پارٹیاں دینِ اسلام، قرآنی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق

مشرکانہ فعل (۳۲ : ۳۰ ، ۱۶۰ : ۶) کی مرتکب نہیں ہیں؟ (س)۔ اگر یہ سیاسی گروہ بندیاں قرآن کریم (۳۲ : ۳۰ ، ۱۶۰ : ۶) کے مطابق مشرکانہ فعل ہیں جس میں کہ کوئی کلام نہیں تو مملکتِ خداداد پاکستان میں مسلم افرادِ معاشرہ کو کیسے اس ناپسندیدہ عمل سے بچایا جا سکتا ہے؟

یاد رہے سپریم کورٹ اپنے فیصلہ بابت سیاسی پارٹیوں کی رجسٹریشن، ۱۹۸۸ء میں ان سیاسی پارٹیوں کو خلافِ قانون قرار دینے کی ہدائت جاری کر چکی ہے جو اسلامی آئیڈیالوجی (AS GIVEN IN THE HOLY QURAN) کے خلاف قائم کی گئی ہوں یا عمل پیرا ہوں!!!

راجہ عبدالرزاق عادل

تقلید

دین کی عمارت اس محکم بنیاد پر اٹھتی ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے اور اس سے اپنی اطاعت کرائے۔ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کے لئے اس نے اپنے احکام و قوانین اپنی کتاب (قرآن) میں دے دیئے ہیں۔ لہٰذا اطاعتِ خداوندی سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ان قوانین کو علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا اور ان پر عقل و فکر کی رُو سے عمل کیا جا سکتا ہے لہٰذا دین نام ہے زندگی کے ہر گوشے میں وحی کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے کام لیکر چلنے کا۔ اس کے خلاف "مذہب" (یعنی انسانوں کا خودساختہ طریق) ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا پرستی اس طریقہ کا نام ہے جس میں انسان عقل و فکر سے کام نہ لے اور جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے اس پر آنکھ بند کر کے چلتا جائے اسے تقلید کہتے ہیں۔ یعنی اس جانور کی طرح چلتے جانا جس کی ناک میں نکیل یا گلے میں رسّی ڈال کر اس نکیل یا رسی کو دوسرے کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔ یہ غلامی کی بدترین شکل ہے۔ غلامی میں انسان کا بدن معتبر اور دوسرے کے تابع ہوتا ہے لیکن تقلید میں انسان کا دل و دماغ دوسرے کی محکومیت میں رہتا ہے مذہبی پیشوائیت کا سارا زور تقلید اور اسلاف پرستی پر ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہی اپنی حاکمیت قائم رہتی ہے وہ "اسلاف کے مسلک" کے نام پر اپنی من مانی کرتے ہیں اور چونکہ عقل و فکر سے کام لینا انسان پر حرام قرار دے دیا جاتا ہے اس لئے وہ انہیں ڈھور ڈنگر کی طرح جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم تقلید اور اسلاف پرستی کے خلاف سب سے بڑا چیلنج ہے وہ اسے کفر اور شرک قرار دیتا ہے وہ ایسے افراد اور قوم کے متعلق کہتا ہے کہ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے۔

قرآنی تعلیم بچوں کے لئے

قاسم نوری

مومن

السّلام علیکم بچو! گزشتہ ماہ ہم نے آپ کو 'مسلم' کا مفہوم اور معانی بتائے تھے اور قرآن کریم کے حوالہ سے یہ سمجھایا تھا کہ ہمارے محترم پیارے اور آخری نبی کو ماننے والے' اور ان کی دعوتِ قرآنی پر ایمان لانے والے ہی 'مسلم' نہیں کہلاتے بلکہ اس دُنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے ان سب کی دعوت پر ایمان لانے والے بھی 'مسلم' کہلاتے تھے ($\frac{22}{78}$) اور ہر پیغمبر لوگوں کو جو دعوت دیتا تھا' سب سے پہلے خود اس پر ایمان لاتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلا 'مسلم' وہ خود ہوتا تھا۔ ہمارے رسول محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان کیا تھا کہ میں سب سے پہلا 'مسلم' ہوں ($\frac{6}{14}$ ، $\frac{40}{66}$).

ہم نے ایک بات اور بتائی تھی کہ اللہ نے قرآن کریم کو ماننے والوں کا نام 'مسلم' رکھا ہے ($\frac{22}{78}$)۔ لہٰذا ہمیں خود کو بھی 'مسلم' ہی کہنا چاہیئے

بچو! آج ہم آپ کو "مومن" کا مفہوم اور معانی بتلائیں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ مُسلم اور مومن میں کیا فرق ہوتا ہے۔

بچو! بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جنہیں ہم سنتے ہیں اور چاہیے ان پر عمل کریں

یا نہ کریں لیکن ان کی سچائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ جیسے آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ صبح سویرے اٹھنا، صبح کی سیر کرنا یا ورزش کرنا اچھی صحت کے لئے ضروری ہوتا ہے ــــ طبیعت میں شگفتگی اور نرمی پیدا ہوتی ہے، دن اچھا گزرتا ہے ــــ یا تم نے سنا ہوگا۔ کہ دوسروں کی مدد کرنا، ضرورت مندوں کے کام آنا۔ بہت اچھا ہوتا ہے ــــ اس سے ایک اچھی اور مضبوط شخصیت (PERSONALITY) بنتی ہے یا بڑوں کا ادب کرنا اور چھوٹوں سے پیار کرنا بہت اچھا اور نیکی کا کام ہوتا ہے۔ اس سے انسان کا وقار بڑھتا ہے اور ایسے انسان کی ہر شخص عزت کرتا ہے ــــ اسی طرح تم نے سنا ہوگا کہ ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے، جھوٹ بولنے والے کی کبھی عزت نہیں کی جاتی، اسے سب لوگ بُری نظر سے دیکھتے ہیں ــــ بچو! یہ سب باتیں وہ ہیں جنہیں اس دنیا میں بسنے والے سبھی لوگ تسلیم کرتے ہیں، مانتے ہیں بلکہ خود بھی اس کی تبلیغ کرتے اور تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے۔ یعنی کسی بات کو صرف تسلیم کر لینا ــــ بھئی ضروری نہیں ہوتا کہ جو شخص کسی بات کو تسلیم کرتا یا تسلیم کر لینے کا اعلان کرتا ہے وہ اس پر عمل بھی کرے ــــ اب دیکھو ناں سبھی مانتے اور تسلیم کرتے ہیں، اس کے باوجود سبھی تو صبح سویرے نہیں اٹھتے۔ نہ سب ورزش کرتے ہیں، نہ سب دوسروں کی مدد کرتے ہیں، نہ بڑوں کا ادب اور نہ چھوٹوں سے پیار ہی ہر ایک کرتا ہے اور نہ ہی ہر ایک سچ بولا کرتا ہے ــــ تو یہ بات کا ایک پہلو یا رُخ کہلائے گا۔ یعنی صرف تسلیم کر لینا ــــ اب بچو! کچھ تو ایسے بھی لوگ ہونگے جو ان باتوں کو تسلیم بھی کرتے

ہیں اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو سب "بات کا دھنی" یا قول کا پکا یا باکردار کہتے ہیں۔ ان کی مثالیں دیتے ہیں۔ انْ کی تقلید کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو ان کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔

بالکل اسی طرح ــــ بچو ــ پیغمبروں کی دعوتِ ایمانی کو جو لوگ مان لیتے تھے تسلیم کر لیتے تھے، انہیں "مسلم" کہا جاتا تھا لیکن جو لوگ مان کر، تسلیم کر کے اُس پر عمل بھی کرتے تھے وہی "مومن" کہلاتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو پھر اللہ تعالیٰ اپنا دوست کہہ کر پکارتا تھا ($\frac{7}{3}$ - $\frac{6}{127}$ - $\frac{7}{196}$ - $\frac{45}{19}$ - $\frac{13}{37}$)

اس بات کو یوں سمجھ لو کہ آج ساری دنیا میں اربوں "مسلمان" بستے ہیں یہ سب قرآن کو مانتے اور اس کو حق "تسلیم" کرتے ہیں۔ بھئی! اسی لئے تو 'مسلم' کہلاتے ہیں۔

لیکن اکثر لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اور اس کے مطابق زندگی نہیں گزارتے لہٰذا وہ کبھی بھی 'مومن' نہیں کہلائے جا سکتے۔ اب دیکھو اس بات یا فرق کو اللہ تعالےٰ نے کس قدر آسان اور اچھے انداز میں سمجھایا ہے :-

"اسلام نام ہے اس ایمان کا، جو دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس اعتبار سے مسلم اور مومن میں فرق ہوگا۔" ($\frac{49}{14}$)

" ایمان لانے کے بعد (یعنی تسلیم کر لینے کے بعد) احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنے سے انسان مومن بنتا ہے" ($\frac{43}{69}$)

"میری صلوٰۃ، میری زندگی کے طور طریق میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے (یعنی اللہ کے قانون کے تابع ہے) یہ ہے ایک مومن کی خصوصیت" ($\frac{6}{163}$)

یہ بھی سمجھ لو بچّو! کہ مومن اسے کہتے ہیں جو ہر حق بات کو اپنے علم اور اپنی عقل سے تسلیم کرے۔ صرف اس لئے نہ مانے کہ والدین ایسا کہتے یا کرتے ہیں۔ استاد یا بڑے ایسا کرتے اور کہتے ہیں بلکہ جب اس کے سامنے حق بات رکھی جائے تو وہ خود سوچے اور اچھی طرح غور وفکر کرے اور اس کے اچھے بُرے تمام پہلوؤں پر غور کر کے پھر تسلیم کرے ـــــ اس طرح تسلیم کرنے کو "ایمان" کہتے ہیں۔ بچّو! یہ جو انگریزی زبان میں ایک لفظ ہوتا ہے نا، FAITH، جسے ہم ایمان کے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں، بنیادی طور پر اس کا یہ ترجمہ یا مطلب غلط ہوتا ہے ـــــ دراصل FAITH کا انگریزی میں مطلب ہے "اُندھا یقین"۔ یعنی رواج اور عقیدہ کی بناء پر لایا ہُوا یقین ـــ عقل کی رُو سے تسلیم کی جانے والی بات کے لئے انگریزی ہی میں لفظ CONVICTION استعمال ہوتا ہے ـــ انگریزی کا FAITH "مذہب" میں تو جائز ہے لیکن اللہ کے دین اور اسلام کے قطعاً خلاف ہے ـــ اور بچّو! مذہب اور دین کا فرق تو تم سب اب اچھی طرح جانتے ہو کہ مذہب انسان کا بنایا ہُوا ہوتا ہے اور دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے دیئے گئے دین کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے والے ہی "مومن" کہلاتے ہیں۔

ANNOOR PRINTERS FOR YOUR PRINTING & PACKAGING NEEDS _ TEL: 042-27 58 26
P.O.BOX 4190. LAHORE-25

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ

قوم۔ قومیّت اور دو قومی نظریہ

انسان نے جب سے ہوش سنبھالا اور اس قابل ہُوا کہ اللہ تعالےٰ اس کے ساتھ بذریعہ وحی بات کر سکے تو اسے وحی سے نوازا۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ انسان اپنے ارتقائی ادوار سے ہوتا ہُوا موجودہ شکل وصورت اور ذہانت کا مالک بنا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان پر ایک ایسا دَور ضرور گزرا ہے جب خود اس کا وجود بھی قابلِ ذکر شئے نہ تھا۔ اس حقیقت کو خود قرآن کریم نے سورۃ الدہر میں بیان کیا ہے۔ سورۃ الدہر کی پہلی آیت کا مفہوم کچھ یوں ہے:۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان (جو اس وقت پیکرِ بشریّت میں موجود ہے) پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کوئی ایسی شئے نہ تھا جو از خود موجود ہوتی (یعنی ہم اسے مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے آہستہ آہستہ اس مقام تک لے آئے۔)

یہاں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے فوری طور پر قرآن کریم ہی سے کیوں حوالہ دیا گیا؟ (ظاہر ہے یہ سوال ایک مسلمان تو نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک غیر مسلم کو بھی تو آخر سمجھانا پڑے گا۔ ہماری کوئی ان سے کٹی تو نہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب بذریعہ وحی کسی بات کو سمجھنے کے قابل نہ تھا تو خود انسان جس چیز سے متاثر ہو جاتا اسی کو اپنے سے بہتر پاکر اپنا خدا، دیوتا، بزرگ و برتر سمجھ بیٹھتا۔ دراصل یہ خود انسان کی وہ جبلّی قوت تھی جو اُسے متلاشی بنائے ہوئے تھی۔ اگر یہ آگ سے متاثر ہُوا ہے تو اس نے آگ کی پوجا شروع کی اور ہوتے ہوتے آتش پرست کہلایا۔ اگر سورج سے متاثر ہُوا تو شمسی کہلایا جس کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے وقس علیٰ ہذا۔ پھر جب خود اپنی طرح کی کسی شخصیت سے متاثر ہُوا تو اس کے جیتے جی اس کی پرستش کی اور جب وہ مرگیا تو اس کا بُت خود اس کے نام پر بناکر اس بُت کی پوجا شروع کر دی۔ کبھی کھڑے بُت کی پوجا کی تو کبھی آج کے ماڈرن دَور میں لیٹے بُت کی پوجا کی تا آنکہ آنے والی نسلوں نے اس بُت کو ہی سب کچھ جانا۔ یہ بُت پرستی کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک جاری رہا۔ یہ تو نہیں کہا

کہ نوح علیہ السلام پہلے انسان تھے جن پر وحی آئی تاہم قرآن کریم سے ایسے نظائر ضرور ملتے ہیں جن سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے دور تک انسان اتنی ذہنی صلاحیتوں کا مالک ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ بذریعہ وحی بات کی جاسکتی تھی۔ یعنی سیلاب سے بچنے کے لئے نوح علیہ السلام کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی تیار کرے اور ضروریاتِ زندگی کے علاوہ اس میں کئی اور چیزیں بھی رکھے۔ پھر جب سیلاب آیا تو خود انؑ کا بیٹا جو انؑ کی ذرّیت تھا یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے اہل میں سے تھا، لیکن نظریاتی یا اشتراکِ ایمان کے اختلاف کی بناء پر اپنی قوم سے غیر قرار دے دیا گیا۔ (تفصیل بعد میں آئے گی) تو بات ہو رہی تھی بُت پرستی کی، چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں بُت پرستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ان بتوں کا ذکر سورۃ نوح میں موجود ہے کہ :-

"اور لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے معبودوں کو بالکل نہ چھوڑنا ـــــ نہ ود کو، نہ سواع کو، نہ یغوث و یعوق کو اور نہ ہی نسر کو ـــــ (یہ مٹی اور پتھر کے تراشے ہوئے بُت درحقیقت ان غیر محسوس بتوں کے محسوس پیکر ہیں جو ان کے قلب و دماغ کے تبکدوں میں نصب ہیں)"

ان بتوں کی پوجا ختم کرنے کے لئے حضرت نوح علیہ السلام نے بُت پرستوں کو عملی طور پر بتوں کی بے بسی ثابت کی۔ یعنی اب یہ ایک حقیقت بن گئی کہ انسان کسی نہ کسی شکل میں محسوس طور پر اپنے لئے کوئی سہارا تلاش کرتا رہا ہے تاآنکہ اس کی عقل پختہ ہوئی اور اسے ایک اتھارٹی ایسی ملنی چاہیئے تھی کہ جس اتھارٹی پر وہ اپنا اطمینان کر سکے۔ ظاہر ہے کبھی انسان کو اتھارٹی خود انسانی پیکر میں ملی اور کبھی کسی اور شکل میں۔ غرض جہاں یہ مطمئن ہوا وہی اس کی اتھارٹی بنی۔ ساتھ ہی ساتھ خود خداوند لم یزل بھی انسان کی ذہنی کیفیت کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ انسان پختہ ذہن ہو گیا۔ لہٰذا خداوند لم یزل اس کے ساتھ آخری بار ہمکلام ہوا۔ انسان کو ایک آئین۔ قانون۔ اتھارٹی۔ راہِ عمل، غرض جو نام بھی اسے دیا جائے کتابی شکل میں بذریعہ سرورِ کائنات، قرآن کریم عطا کر کے چھوڑ دیا۔ یہی وہ اتھارٹی تھی جس کی آئت شروع میں پیش کی گئی۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ خود قرآن کریم نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف آسمانی کتابوں میں انسان نے اپنی ضروریات کے پیشِ نظر تحریف کر دی اور ان کی اصلی شکل برقرار نہیں رہ سکی یا اسے بھی ایک تجرباتی دور سے تاویل کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے ایک ایسے ضابطۂ حیات کی ضرورت انسان کو درپیش ہوئی جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداوند لم یزل نے لے لی۔ اور وہ قرآن کریم کی شکل میں بنی نوعِ انسان کے لئے بطور ذکر، للعالمین بذریعہ رحمت للعلمین منجانبِ رب العالمین نازل کیا گیا۔

یہ اپنے طور پر ایک تاریخی دستاویز، ایک مکمل ضابطۂ حیات، قانون اور زندگی سے متعلق ہر پیچیدگی کا حل رکھنے والی کتاب ہے۔ لہٰذا اس کے احکامات کسی قبیلے، محلّے، گاؤں، شہر، ملک یا کسی محدود علاقے کے لئے نہیں ہیں، بلکہ بنی نوع انسان یا کرۂ ارض پر موجود 'اقوام' کے لئے ہیں۔ قوم کا لفظ قرآن کریم میں تقریباً تین صد بار استعمال ہوا ہے۔ بعض آیات میں ایک ہی آیت میں دو بار بھی استعمال ہوا ہے (اگرچہ اس مختصر سے مضمون میں تین صد مقامات کا احاطہ مشکل ہے۔ اسی ایک لفظ پر راقم کی خواہش ایک کتاب لکھنے کی ضرور ہے) قوم اور قومیت نیز دو قومی نظریے کی تعریف حتی المقدور مضمون پیشِ نظر میں کر دی جائیگی۔ جس سے خداوندِ کریم کے نزدیک قومیت کا تصور خود قرآن کریم ہی سے سامنے آجائے گا۔ یعنی قومیت کی بنیاد یا کسوٹی کیا ہونی چاہیئے۔ آیا قرآن کریم کے مطابق قومیت کا معیار رنگ، نسل، خون، علاقائی وابستگی وطنیت، لسانی امتیاز۔ معاشی خوشحالی، سیاسی وابستگی، یا کوئی اور چیز ہے، جس سے سب کے سب ایک ہی قوم کے افراد کہلائیں گے چاہے ان کا تعلق مذکورہ کسی بھی شق سے کیوں نہ ہو، ان کا جغرافیائی ماحول بھلے مختلف ہو۔

عام طور پر قومیت کے سلسلہ میں قرآن کریم کی مشہور و معروف سورہ الحجرات کی آیت ۱۳ کچھ اس طرح پیش کی جاتی ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا

ترجمہ:۔ اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ (اشرف علی تھانوی مرحوم)

جہاں شعوبًا کا ترجمہ قوم کیا جائے اور قبائل کا ترجمہ خاندان کیا جائے۔ ظاہر ہے اس کے اثرات اس قسم کے مرتب ہونگے۔ جو آج ہمیں نظر آرہے ہیں۔ یہی وہ ظلم ہے جو اسلامی تمدن اور اسلامی دنیا کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نادانستہ سہی لیکن ہوا ضرور ہے۔ جہاں قرآنی الفاظ کو نہ بدلہ جا سکا وہاں اس کا مفہوم یا معنی بدل کر اسے اتنا گنجلک بنا دیا گیا کہ قرآنی روح مفقود ہوتے ہوتے آخر مفقود ہوگئی (جیسے صلوٰۃ کا ترجمہ نماز اور صوم کا روزہ کر کے نظر ڈالیے۔ حج اور زکوٰۃ کا ترجمہ اس لئے نہ ہو سکا کہ حج جہاں سے شروع ہوا آج بھی وہیں ہے اور زکوٰۃ کا تصور سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا کسی اور مذہب میں یہ تصور موجود نہ تھا اس لئے اس کا ترجمہ بھی نہ ہو سکا) ادھر جو آیت پیش کی گئی اس آیت کا مفہوم آیت کی ابتداء سے سمجھا جائے تو آیت واضح ہو جائے گی۔ آیت کی ابتداء بنی نوع انسان کی تخلیق سے ہوتی ہے۔ یعنی:۔

"جن معاشرتی برائیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسروں کو حقیر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی جذبہ انسانی زندگی کے اور گوشوں میں بھی کارفرما ہوتا

ہے۔ مثلاً مردوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ عورتوں سے افضل ہیں یا بعض خاندان نسبی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے معزز تصور کرتے ہیں یہ دونوں تصورات غلط ہیں) ہم نے انسانوں کو مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا کیا ہے (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسانی بچے میں — خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ عورت کا — اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ مرد، عورتوں سے افضل ہیں، یا عورتیں مردوں سے الگ ہیں) باقی رہے مختلف خاندان یا قبیلے تو اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔ ورنہ، نہ کوئی قبیلہ دوسرے سے افضل ہے، نہ کوئی خاندان، دوسرے خاندان سے معزز۔ میزانِ خداوندی کی رُو سے عزت اور تکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ تم میں سے کس کی زندگی قوانینِ خداوندی سے زیادہ مطابق ہے۔ کون ان کی زیادہ اطاعت کرتا ہے۔ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے، وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یا کسی خاندان یا قبیلہ میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں معیارِ فضیلت، حسب و نسب نہیں، ذاتی جوہر اور سیرت و کردار کی بلندی ہے۔ یہ بات خدا کہہ رہا ہے جو اچھی طرح جانتا ہے کہ فضیلت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے" (۴۹/۱۳)

اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ تقسیم خود خداوندکریم کی ہے اور انسانوں کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے محض سمجھ کی کمی ہی ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں۔ کیا خداوندِ کریم نے کسی بھی وحی کے ذریعے کہیں کسی بھی الہامی کتاب میں خاندانوں یا قبیلوں کی ایسی کوئی تقسیم کی ہے جس سے پتہ چلے کہ فلاں خاندان قریشی۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ زیدی۔ صدیقی۔ فاروقی۔ عثمانی۔ حیدری وغیرہ وغیرہ اور نجانے کتنی بار وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اب اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو یہ تمام خاندان یا وابستگیاں شخصیات ہی کی طرف منسوب ہیں۔ ہر قبیلہ یا خاندان کسی ایک شخصیت پر اوپر جاتے جاتے رُک جاتا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے یہاں مختلف خاندانوں یا نسبی وابستگیوں کا اتنا رواج نہیں تھا۔ یہ تعارف ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے عام کیا۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کو اپنے خاندان میں ایسی کوئی برتری بظاہر نظر نہیں آتی تو وہ خود کو کسی علاقے، شہر یا گاؤں سے وابستہ کر کے سرحدی۔ دہلوی یا ہزاروی کا لاحقہ لگا کر اپنے تشخص کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ ہے وہ جغرافیائی وابستگی۔ اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تفریق یا اونچ نیچ خود انسان کی پیدا کردہ ہے تو دیکھنا یہ پڑے گا کہ خداوندکریم کے نزدیک ایسا کون سا معیار ہے جس سے لوگ دائیں اور بائیں میں خود بخود تقسیم ہو جاتے ہیں۔ (یاد رہے دائیں بازو اور بائیں بازو کی اصطلاح قرآن کریم میں کئی موقعوں پر استعمال ہوئی ہے) اب یہاں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے خود انسانوں کو دو علیحدہ

قوموں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ سورۃ تغابن کی آیت ۲ میں ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اس نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا (جس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ تمہیں اختیار و ارادہ کی استعداد حاصل ہے) انسان کی اس استعداد کا نتیجہ یہ ہے کہ تم میں سے بعض کافر (قوانینِ خداوندی کو تسلیم نہ کرنے والے) اور بعض مؤمن (ان قوانین کو ماننے والے) ہو جاتے ہیں۔ (کائنات میں کسی اور مخلوق کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے انکار کر دے۔ یہ خصوصیت انسان ہی کے لئے ہے اور اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے (۲۹ : ۱۸) (پھر اس کا اختیار تو انسان کو دیا گیا ہے کہ یہ چاہے تو صحیح راستہ اختیار کرلے اور چاہے غلط راستے پر چل پڑے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ چلے تو غلط راستے پر اور نتائج برآمد ہوں صحیح راستے کے۔) اس کے اعمال کے نتائج خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جو سب کچھ دیکھتا ہے"

قرآنِ کریم کے نزدیک یہیں سے دو قومی نظریے کا آغاز ہوتا ہے یعنی ایک وہ قوم قرار پائی جو قوانینِ خداوندی سے یکسر منکر ہوئی اور دوسری وہ قوم جس نے قوانینِ خداوندی کو دل و جان سے مانا اور اس کے نتائج پر ایمان لائی۔ ورنہ خداوندِ کریم نے انسان کو انسانی پیکر میں پیدا کیا۔ بلحاظِ انسان یا ان تمام خصوصیات کے جو انسان ہونے کے ناطے دنیا کے تمام انسانوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ ایک قوم اور ایک ہی ملت قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن اشتراکِ ایمان یا یقینِ محکم نے تفریق کی حدِ فاصل کھینچ دی۔ پھر اگر یہ تفریق یا حدِ فاصل باپ بیٹے کے درمیان کھینچی جا سکتی ہے، بیٹے اور باپ کے درمیان، چچا اور بھتیجے کے درمیان کھینچی جا سکتی ہے، لہٰذا کسی اور کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ اب اگر ذرا غور کیا جائے تو اشتراکِ ایمان نے خونی رشتے کو بھی کاٹ کے رکھ دیا۔ یہی وہ مثال ہے جو حضرت نوح علیہ السلام اور اس کے بیٹے کی۔ حضرت ابراہیمؑ اور اس کے والد کی، حضورؐ اور ان کے چچا کی ہمارے سامنے ہے۔ حضرت بلالِ حبشیؓ کو حضور نے سیدنا بلالؓ کا خطاب اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر دیا۔

ہمارے اکثر محترمین جب مثالیں دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خود قرآنِ کریم میں قومیت پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی قوم عاد۔ قوم ثمود۔ قوم لوط قوم موسیٰ وغیرہ وغیرہ۔ ہم کبھی بھی اس سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی نبی بہرحال کسی قوم کی طرف تو آتا ہی ہے اور یہی قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں کہ "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" ہم نے ہر قوم کی طرف ایک ہادی ضرور بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ

انسانوں کا ایک ہجوم اگر ایک علاقے میں رہتا ہے۔ ان کا لباس، انکی قدریں۔ تہذیب تمدن۔ معاشرتی زندگی۔ جغرافیائی ماحول۔ زبان۔ سیاسی کردار غرض سینکڑوں قدریں مشترک ہیں۔ ان اقدار کے اشتراک کے حوالے سے اس ہجوم کو بھی قوم کہا جائے گا۔ لیکن جب بات اشتراکِ ایمان کی آئے گی تو وہ قوم "عاد"، قوم ثمود اور قوم موسیٰ ہوتے ہوئے بھی ایک علیحدہ قوم بن جائے گی۔ یہ اشتراکِ ایمان ہوگا۔ کسی بھی زبان میں اور متاثر کرے گا دوسری زبانوں کو، دوسرے ماحول کو، اس طرح مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک قوم بنتی چلی جائے گی۔

ذرا مزید غور فرمائیے! قرآن کریم میں قوم کا لفظ سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس قوم کے لئے استعمال ہوا جس کی تربیت کرنے اور اسے علیحدہ قوم بلحاظ اشتراکِ ایمان بنانے کے بعد وہ کوہِ طور پر چالیس راتوں کے لئے چلے گئے تھے (سورہ بقرہ آیت ۵۴) جب واپس آئے تو یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جب موسیٰ (چالیس راتوں کے بعد) اپنی قوم کی طرف واپس آیا، اور اس نے دیکھا کہ قوم گئوسالہ پرستی میں مصروف ہے تو اس نے ان سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم اس سے انسانی سطح سے بہت نیچے گر گئے ہو (۱۵۲ : ۷) اب پھر اس مقام کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی غلطی کا اعتراف کرو اور نہایت عجز و انکسار سے قوانینِ خداوندی کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قوانینِ خداوندی کے ان خوشگوار اور زندگی بخش نتائج سے پھر مستفید ہو سکتے ہو، جو اس وقت تم سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان قوانین میں یہ خصوصیت ہے کہ جب بھی کوئی ان کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ ربوبیت کے تمام سامان اپنے ساتھ لئے، اپنا رُخ اس کی طرف پھیر دیتے ہیں۔"

اسی طرح اسی سورۃ میں آیت ۱۱۸ ملاحظہ فرمائیں جو دوسری آیت بلحاظِ قوم ہے:۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

"اسی طرح وہ اپنی نشانیاں اس قوم کی طرف بھیجتا ہے جو قوم راہنمائی قبول کرنا چاہے۔"

سورۃ نوح میں مزید وضاحت موجود ہے اور اس طرح قرآن کریم کے پارہ ۲۹ میں قوم کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے جس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قومیت کا انحصار اشتراکِ ایمان پر ہے دیگر کسی خصوصیت کی بناء پر نہیں ہے۔ یہی وہ دو قومی نظریہ تھا جس کی بناء پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ آپ غور فرمائیں۔ ہندوستان میں اس وقت کی موجود سیاسی جماعتوں میں واحد مسلم لیگ ایسی جماعت تھی جس کے ارکان سب کے سب مسلمان تھے، جبکہ پاکستان کی مخالفت میں جتنی بھی جماعتیں تھیں ان میں اشتراکِ ایمان پر کوئی پابندی نہ تھی۔ کانگرس جس کی بنیاد ایک انگریز لارڈ ہیوم نے رکھی تھی اس میں ہندوؤں کے علاوہ

اُس وقت کے دیوبند یافتہ بڑے بڑے مولویانِ کرام بھی شامل تھے جن کے سرخیل حسین احمد مدنی مرحوم۔ابوالکلام آزاد مرحوم اور اَنجہانی گاندھی اور نہرو تھے۔ پھر جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو پاکستان دشمن قوتوں نے اپنی شکست کا انتقام یہ کہہ کر لینا شروع کیا کہ پاکستان چار قومیتوں یعنی چار پھولوں کا ایک گلدستہ ہے دیارِ غیر میں لیبن پرائز لینے کے بعد جب فیض احمد فیض واپس آئے تو چار پھولوں کے گل دستے کی باتیں کرنے لگے۔ دوسری طرف گاندھی کی طرف سے داغِ مفارقت کھانے کے بعد صوبہ سرحد کے سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں مرحوم نے پختون قوم کا راگ الاپنا شروع کیا۔ سندھ سے جی ایم سید نے اپنی ناعاقبت اندیشی کا اظہار شروع کر دیا۔ بلوچستان سے عبدالصمد اچکزئی نے ایک نیا سُر ڈالا۔ آہستہ آہستہ یہ فسوں اپنا اثر دکھاتا گیا۔ حاکمانِ وقت کو اقتدار سے فرصت نہ ملتی تھی۔ بچوں کو ایسی تعلیم دی گئی کہ کالجوں کو تو ایک طرف کیجئے چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں بھی سیاسی عمل دخل شروع ہوگیا۔ قوم پرستی نام کی شئے جغرافیائی حدود اور زبان کی حد تک کھل کر سامنے آنا شروع ہوئی۔

جغرافیائی یا لسانی امتیاز پر اگر قومیت کی بنیاد رکھی جائے تو اس کی خشتِ اوّل نفرت اور عداوت سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ کوئی بھی قوم جب دوسری قوم کے ساتھ ٹکراتی ہے تو اسے اپنی قومیت کا احساس ہوتا ہے۔ عرب صرف اور صرف اس لئے ذلیل و خوار ہیں کہ وہ اپنے آپ کو عرب سمجھتے ہیں۔ اگر انہوں نے محمد عربی کا پیغامِ آخری پڑھا تک ہوتا تو وہ کبھی بھی خود کو عرب نہ کہتے۔ دورِ حاضر کے عالم برٹرینڈ رسل اپنی کتاب "ہوپ فار دی چینجنگ ورلڈ" میں لکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اگر معاشرتی روابط قومی حدود سے باہر نہ نکلے تو اس کی وجہ اس کے راستے میں نیشنلازم کی گھاٹی ہے۔ اس دنیا میں تباہی کا سبب نیشنلزم ہے۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ نے بھی نیشنلزم کی سخت مخالفت کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دین ہے، تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے کیوں مسلماں کو؟
محبت کا بیاں ہو جا۔ محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، یہ خراسانی، یہ افغانی یہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

من حیث القوم مسلمانوں کی خارجہ اور داخلہ پالیسی تک کا ذکر قرآن کریم نے سورۃ الفتح میں کر دیا ہے "کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفّار پر سخت اور آپس میں رحم دل" اب رُک کر غور کیجئے۔ آج یہی پالیسی بالکل اُلٹ بنی ہے۔ سورۂ توبہ میں تو اس کی مزید وضاحت بلحاظ اشتراکِ ایمان کر دی گئی ہے، "اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور محبوب نہ رکھو۔ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو محبوب رکھیں۔ تم میں سے جو کوئی ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔ پورے قرآن کریم میں کسی ایران۔ توران۔ یونان۔ افغان۔ ہندوستان یا پاکستان کا ذکر نہیں۔ جتنی بھی قوموں کا ذکر ہے وہ سب کی سب چند مشترک اقدار کی وجہ سے ایک قوم شمار ہوئی ہیں۔ یعنی قومیّت کا معیار نہ تو نسلی، نہ وطنی، نہ خونی، نہ لسانی، نہ جغرافیائی پڑا، بلکہ اگر معیار پڑا تو اشتراکِ ایمان اور وہ بھی قرآن کریم پر کما حقہٗ ایمان پڑا...... اور بس!

اسلامی نظام

اسلامی نظام کے سلسلہ میں اس اصولی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کے ضمن میں جن ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیا ہے (مثلاً رزق بہم پہنچانا) ان کا پورا کرنا اسلامی نظام کی ذمہ داری ہوتا ہے اور جب وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے تو پھر افرادِ معاشرہ سے اسلامی احکام کی اطاعت کراتا ہے۔ اس میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ حضورؐ ہی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ لہٰذا اس نظام کی اطاعت کو "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے بعد حضورؐ کے جانشین اس نظام کی مرکزی اتھارٹی قرار پائے اسلئے ان کی اطاعت بمنزلہ اطاعتِ خدا اور رسولؐ تھی یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کے ساتھ اس کی صراحت کر دی ہے وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (۸/۲۰) درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔ لہٰذا اطاعت ایک زندہ محسوس اتھارٹی کے ذریعہ ہوگی جس کے احکام سنے جا سکیں۔ لیکن احکام وہ خدا ہی کے ہونگے۔ اسلامی نظامِ مملکت، درحقیقت قرآنی احکام وقوانین واقدار واصول کے نفاذ کی ایجنسی ہوتا ہے۔ بہ ہیئتِ مجموعی، اسلامی نظام خدا کی ان صفات کا مظہر ہوتا ہے جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔

Act, 1962 and all other provisions of the said Act which facilitate the formation or organizing more than one Political Parties is contrary to Holy Quran and Sunnah of the Holy Prophet (peace be upon him). Therefore it is respectfully prayed that the impugned Law be declared contrary to the injunction of Islam as contained in the Holy Quran and Sunnah of the prophet " " MUHAMMAD " (Peace be upon him).

.....

The Petition is still under hearing. Mr.Abdullah Sani, Advocate has also appeared before the Honourable Court. Other submissions made to the Court, in Urdu, are also reproduced on page to ibid)

.....

BY THE WAY

FOR ALL INQUIRIES ABOUT THE MAGAZINE AND ITS SUBSCRIPTION PLEASE ALWAYS QUOTE SUBSCRIPTION NUMBER RECORDED ON LEFT CORNER OF THE WRAPPER.

TO KEEP THE MAGAZINE IN CIRCULATION PLEASE DO NOT FORGET TO RENEW YOUR SUBSCRIPTION. PLEASE ALSO REMEMBER YOUR FRIENDS AND RELATIVES RECEIVING MAGAZINE AT YOUR ACCOUNT AND RENEW THEIR SUBSCRIPTIONS AS WELL.

BECAUSE OF NOMINAL SUBSCRIPTION, GIFT SCHEME AT HALF RATE, SHALL NOT BE EFFECTIVE FROM JANUARY 1, 1991.

TOLU-E-ISLAM BAZMS ABROAD ARE REQUESTED TO DISCHARGE THEIR OBLIGATIONS AND ARRANGE PAYMENT OF SUBSCRIPTION FOR THE ENSUING YEAR BEFORE DEC 31, 1990.

BOOK SELLERS AND NEWS AGENTS ARE ALLOWED 33% COMMISSION ANYONE BUYING MORE THAN 5 COPIES AT A TIME CAN ENJOY THIS OFFER. CHEQUES ARE ACCEPTED.

LET TOLU-E-ISLAM BE READ BY ALL YOUR FRIENDS

Ummah and not to divide into parties and Factions or sects etc. The Holy Quran Says :-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا
تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا ۳:۱۰۳

It gives a concept of brotherhood amongst the believers and ordains that :-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ۴۹:۱۰ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا ۳:۱۰۵

the greatest charge against Pharaoh of Egypt by Allah was that he adopted a policy by which he used to create various parties and factions among the people to rule by weakening one party and strengthening the other :-

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ
أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ④ ۲۸:۴

Creation of parties, factions and sects in Muslim Ummah is greatest sin which has been termed by Almighty Allah as High Treason " *shirk* " against Almighty Allah. The following verses of Holy Quran may be considered to measure the gravity of sin or offence which is being committed by formation of parties or factions and sects in Muslim Ummah" -

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۳/۱۰۵	إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۶:۱۶۰
وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ ۹:۱۰۷	وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۶:۱۵۳
وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۴۲:۱۴	وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۴۲:۱۳

The Holy Prophet (peace be upon him) said that Muslim Ummah is like a single body:

الْمُسْلِمُ وَالْمُؤْمِنُونَ كَجَسَدٍ وَاحِدٍ

Therefore in view of the aforementioned teachings of the Holy Quran and sayings and conduct of the Holy Prophet (peace be upon him) formation of more than one parties, whether or political, religious, racial, sectarian, regional, on linguistic basis or personality cult, in Muslim Ummah is prohibited by Allah and as such the provisions of Law contained in Section 4 of the Political Parties

In the Name of Allah the Rahman, the Raheem.

POLITICAL PARTIES IN ISLAM

REPRODUCED BELOW IS, FOR THE INFORMATION OF READERS OF TOLU-E-ISLAM, A COPY OF PETITION FILED IN THE FEDERAL SHARIAT COURT, ISLAMABAD, BY RAJA ABDUL RAZAQ ADIL, THROUGH Mr. GHULAM MUSTAFA AWAN, ADVOCATE.

Petition : Under article 203-D of the Constitution of Islamic republic of Pakistan, 1973 , to declare that the Provision of Law contained in section 4 of the Political Parties Act, 1962 in so far as it allows more than one Political Parties to form and organize its activities allegedly placing their reliance on the ideology of Islam, and other provisions of the said Act, facilitating the formation of more than one Political parties in the Country is contrary to the injunctions of Islam as contained in the Holy "Quran" and "Sunnah of the Prophet (Peace be upon him)

Respectfully sheweth,

1. That the Petitioner is a Muslim, adult, and citizen of Pakistan.

2. That the Petitioner has not filed any other petition or instituted any proceedings in any other Court in Pakistan.

3. That the addresses of the parties are correctly given in the heading of the petition for service of summons etc.

4. That it is conviction of the petitioner that Holy Quran is revealed by Almighty Allah upon Prophet "MUHAMMAD" (peace be upon him), for the guidance of Muslim Ummah and humanity at large, which must be followed and acted upon in an Islamic State.

5. That according to the teachings of the Holy Quran formation of more than one party a group of people, whether for political or religious purposes, who are alleged to have inspired by the Islamic ideology, is prohibited by Almighty Allah in an Islamic State. The emphasis of the teachings of Holy Quran is, to maintain unity of

Clause 13. Ultimate object of the Islamic state is :

(a) To remove the differences which have arisen between mankind and make them one universal brotherhood on the basis of Divine Fundamental Principles.

(b) To evolve a system of peace, tranquility and justice in the world, based on the principle of equality and respect for mankind.

(c) To form a system of nourishment to individuals, in order to fulfil the needs of their body and personality.

(d) To make strenuous efforts to explore all natural resources for the welfare and well- being of mankind at large.

The above clauses, of course, are by no means exhaustive, yet they being suggestive may tend to represent a cursory view point of the author as based on his own study of the Holy Quran in this respect. The subject even otherwise is demanding and as such does not brook a casual and cursory treatment nor it could be within the comprehension of this small treatise.

Chapter 5 of the booklet evaluates *Ahadith and Fiqah* laws. Here too the author's treatment is light for the vital importance of the monumental works of *Hadith* and *Fiqah* cannot easily be brushed aside merely on the basis of a few stray remarks. Hence the subject deserves a more critical and sympathetic study.

To sum up, the booklet, ***Quranocracy*** on the whole, is a fairly good attempt to interpret the Quran by Quran and can certainly be helpful for those who tend to bring an Islamic Social Order based solely on the fundamentals of the Quran.

The booklet covering one hundred large size pages is neatly produced at An-nooor Printers and Publishers and can be had from Khalid Publishers, 50 Usman Block, New Garden Town Lahore.

.....

and political parties shall be strictly prohibited.

Explanation: As it is difficult to eliminate religious sects in one stroke these can be gradually eliminated under the Quranic guidance and practice.

Clause 5. In order to conduct the affairs of an Islamic state, the centre shall comprise the Head of the state and his consultative machinery i.e. Head of the State, Ministers of his cabinet, members of the Legislature and the Executive. However, they all ought to be conversant with the Quranic principles and injunctions for their proper implementation.

Clause 6. The Legislature of an Islamic State shall have the right to frame bye-laws within the boundary walls of the immutable Quranic principles.

Clause 7. The entire performance of an Islamic state shall be consistent with the basic concept of justice as given by the Quran.

Clause 8. The State shall fulfil all those responsibilities which Allah has taken upon Himself in respect of human beings, particularly in the economic field, in the matter of *Rizq*.

Clause 9. The means of production shall remain in the custody of state as Trust to be expended on the welfare of the individuals of the state.

Clause 10. The individuals of the State shall consider their life and prosperity as a trust of the State and the State in return shall provide protection, peace and prosperity to its individuals.

Clause 11. All basic rights incorporated in the Holy Quran shall be made available to the individuals of an Islamic State.

Clause 12. Kind treatment be given to the non-Muslims living in an Islamic state and they shall have all the human rights concerning their life, property, honour and protection of their places of worship, but they shall not take part in the affairs of the State because they do not accept the Islamic constitution being Non-Muslim within the state.

not differ among themselves except through mutual contumacy. Allah (by His grace) guided the believers to the truth, concerning that wherein they differed. For Allah guides whom He wills, t a path that is straight." (2:213)

According to the author, one God, and one Book as the final code of life revealed by Him shall result into the formation of one World government and all differences of race, caste, colour, creed, language etc. can also be eliminated and shall ultimately sink by means of subservience to the final, complete and the only all-embracing message of Quran till now preserved in its original, unadulterated form, on the face of earth.

Chapter No. 4 is more significant as it deals with the issue of " Constitution" of Islam. The author, of course a non- jurist, at first describes in brief lapses of constitution as prevalent in the world, mainly dilating on two forms of flexible and rigid constitutions. He then refers to the functioning of an Islamic state which was formed for the first time by the Holy Prophet (peace be upon him) which lasted only for a short period during the reign of his four caliphs and was then changed into Kingship by the latter caliphs. However he observes that as a result of a critical study of the relevant verses of the Holy Quran, broad outlines of constitution may be summarized as under:

Clause 1. The Sovereignty in an Islamic State shall be that of Allah. None else beside Him shall have the sovereign power.

Clause 2. In the state the sovereignty in practice shall be that of the Holy Quran which means that the government shall be established according to the Quran and nothing against it shall be accepted.

Clause 3. The establishment of a government, shall be the duty of *Millat*-e-*Islamia* and this shall be carried out by their mutual consultation (*Shura*). Thus an Islamic State shall be " *Jamhooria - Shuraiya*" - Democracy by consultation.

Clause 4. In an Islamic State, the people as a whole in the capacity of being a single party shall form the Government and the presence of religious sects

Chapter 2 of the booklet deals with " Search of Eternal and Unchangeable Laws" and the author, after discussing the subject at some length with particular reference to Christianity and the verses of the Holy Quran, concludes that sovereignty of Allah means the Sovereignty of Book of Allah, comprising eternal values and that "*shura*" as central command of the Consultancy Organization of believers is an instrument to enforce the Divine Laws and it is not allowed to exercise its personal authority. The author then enumerates a number of permanent values such as " Respect for Humanity, Position in Society on the basis of piety, freedom from all types of human slavery, dispensation of justice, concept of *Ehsan*, principles of equality and rules for enforcement of Quranic Social Order as to what is lawful according to Divine Laws and what is unlawful, thereby rendering back the trusts amongst the people to whom they are due.

chapter No. 3 of the booklet deals with the failure of the systems of Nationalism and Inter-Nationalism. He particularly observes that " the political objective in the world, as laid down by the Quran for humanity is " Universalism" which shall be achieved by adopting a common code of life obtainable from the Quranic Injunctions, Laws and permanent values. "

As to Nationalism the author observes " The greater the extent of Nationalism, the more power is vested in the Nation - State, the more impregnable becomes nationalism. The stronger the Nation-State, the more inevitable and the more imminent the danger of conflict between them."

As to the Internationalism, for example, the author observes, " The United Nations Organization is no better. UNO is a complete failure as far as the solution of political and economic problems of humanity are concerned. It is no more than a medium to perpetuate exploitation of one nation by the other."

The author discusses " Universalism" as based on the Holy Quran. The Quran says:

> " Mankind was one single Nation and Allah sent messengers with glad tidings and warnings and with them He sent the Book in Truth , to judge between people in matters wherein they differed. But people of the Book, after the clear signs came to them, did

politician maneuvers to hold a firm grip on the mental outlook of the products of his oratory".

The author , further, on the basis of the relevant verses of the Holy Quran observes that Western Democracy and Quranocracy are two incompatibilities and that basic difference lies in the concept of sovereignty, for, in a democratic Parliamentary form of government, the sovereignty lies, as they say, in the people but in an Islamic State, sovereignty lies in the institutions, laws and permanent values which are contained in the Quran for the guidance of mankind and safety and protection of which code Allah has taken upon Himself. The author has also criticized the concept " ***Delegation of Allah's Powers***" which forms a part of the Pakistan Constitution. According to him this concept took its origin amongst the Christians and gave birth to theocracy, generating also the doctrine of the Divine rights of a King. This concept crept into Islam after the caliphate, when the Muslim Kings began to call themselves as " *Zill-Ullah*"(Shadow of God on earth.) The author contends that the concept of delegation of sovereignty of Allah is absolutely false from the Quranic point of view as delegation of powers from one being to another being implies that the former has given up in favour of the latter who has gained absolute control of power for a certain period and that the exercise of this power by the former becomes suspended in the meantime. Also that the occasion for the delegation of powers by certain authority arises only when that authority itself is not present at the place where the power is to exercised, whereas Allah is omnipresent and the question of his being not present at anytime or anywhere even for a fraction of a second does not arise nor Allah ever divests Himself of His powers by way of any such delegation. The author further observes that Allah is the only sole and exclusive sovereign and the fundamental principles given by Him in the Quran are permanent and immutable and thus the legislature of an Islamic State " is not authorized to exceed the limits laid down by these fundamentals" and that at the most it can make bye-laws or change the existing bye-laws according to the needs of the changing times, of course within the boundary lines drawn by the Quranic fundamentals, by means of " *Shura* " - " Consultation" and that even this machinery for implementation of *shura* is changeable with the change of time and circumstances but *shura* itself is a permanent injunction.

Nature - All providing a living proof of the existence of the Creator". His another book " *Gate Way to The Quran*" also relates to the scientific explanation of sura Al-Fatiha - the prelude of the Quran and as such it too opens the door to the Quran. His latest booklet " *Quranocracy*" is another welcome addition to his earlier works in the same series. In this booklet Dr. Abdul Wadud at the very outset proclaims"

NOT DEMOCRACY
NOR AUTOCRACY
NOR THEOCRACY
BUT QURANOCRACY

The first chapter of this booklet deals with Democracy. The subject is analyzed scientifically and then in the light of opinions of experts on Democracy, defects of this system are clearly pin-pointed, observing that our own experience of Democracy in Pakistan is also an instance at hand. Elucidating the point, Dr. Abdul Wadud observes " Every election in Pakistan bring forward a good number of imbeciles, most of them having poor academic back ground. Their opinion can easily be purchased by any body who possesses sufficient money. They get elected because of their wealth with which they buy votes and after being elected they get their wealth spent by them, multiplied manifold, by unfair means. They can even be bribed to change parties and neither the buyers nor the bought feel ashamed of it. The term *Horse trading* is prevalent for this disgraceful act of these people. They are so much absorbed in greed and selfishness that they have neither time nor capacity to perform the functions of law-making.

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

"As human idea can not arise from the brains of two hundred donkeys"

Majority of them have no political back ground and some of them are mere oratorical prostitutes who stir human sentiments not by display of body but by display of rosy words. Oratory is a precious human virtue but it becomes a sinful act when used for selfish ends. In a country like Pakistan, Politics is an easily accessible vocation. Every vocation needs some sort of training. Businessman, mason, carpenter; but politicians in Pakistan are an exception. A shrewd

In the Name of Allah the Rahman, the Rahim.

QURANOCRACY

Book Review
by
GHULAM RASUL AZHAR
M.A.LLB
Former Senior Special Judge
Anti Corruption, Punjab.

Dr. Sayyid Abdul Wadud, author of the booklet "Quranocracy " by profession an eminent surgeon, belongs to an erudite, scholarly sayyid family of Jullundur (East Punjab). By virtue of the noble traditions of his ancestor-hood, he, too, is deep drunk at the fountain head of Islam. His distinguished and remarkable career as a medical man, particularly as a surgeon, for long, cloaked his real personality as a keen religious scholar. However, to quench his thirst, during his busy career as a surgeon, he, for quite some time, remained associated with the *Khaksar* Movement and its great leader *Allama Inayat Ullah Khan, Al-Mashriqi*. Later on, he remained closeted with another distinguished scholar, and rational thinker *Allama Ghulam Ahmad Parwez* who fascinated him till the end of his life and to whom he still takes as his guide and teacher. Yet despite all that, Dr. Abdul Wadud possesses his own personality, entity and identity, as a student of Quran with the insight of a scientific realist, being basically a medical man. As such he, from time to time, has tried, and of course, with singular success, to interpret quite a large portion of Quran particularly concerning the Phenomena of Nature for whose observation and comprehension even Allah the Almighty repeatedly draws the attention of man.

The Quran is a unique book for all times and at all levels it propounds Universal Truths. Dr. Abdul Wadud has thus ably handled the subject and has given " an explanation of certain Quranic verses, on the basis of science " in his first scholarly work captioned " *Phenomena of Nature and the Quran*". It is indeed a remarkable exposition of the verses of the Holy Quran, quoting scientific studies in various fields of science, in such a manner that even a layman may be able to follow it with ease. His another equally important work " *The Heavens, the Earth and the Quran* " further gives an insight into the creative arts of the Creator and the immutability of the laws of the